سید محمد باقر الصدر
آزمائش
www.kitabmart.in
دارالثقافۃ الاسلامیۃ پاکستان

(قرآن کی روشنی میں)

شہید راہ حق

حضرت آیت اللہ سید محمد باقر الصدر علیہ الرحمۃ

کے

۲ دو اہم خطبات

یکے از مطبوعات

دار الثقافۃ الاسلامیۃ پاکستان

۲ - بے - ۵/۴ ـــــ ناظم آباد ـــــ نمبر ۲ ـــــ کراچی

نام کتاب ــــــــــــــ آزمائش

قلم ــــــــــ آیت اللہ شہید سید محمد باقر الصدر

مترجم ــــــــــــــ سید رضی جعفر نقوی

کتابت ــــــــــــــ سید جعفر صادق

ناشر ــــــــــ دار الثقافۃ الاسلامیہ پاکستان

طبع اوّل ــــــــــــــ ۱۴۰۶ھ - ۱۹۸۶ء

تعداد ــــــــــــــــــ ۲۰۰۰

طبع دوم ــــــــــ شعبان ۱۴۱۱ھ فروری ۱۹۹۱ء

تعداد ــــــــــــــــــ ۲۰۰۰

فہرست

گفتارِ مترجم

آزمائش کے موضوع پر شہیدِ راہِ حق، استاذ معظم حضرت آیت اللہ آقائے سید محمد باقر الصدر علیہ الرحمۃ کی گرانقدر پیش کش، اُردو داں حضرات کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی جارہی ہے۔

افسوس صد افسوس ۹ راپریل ۱۹۸۰ء کو عالمِ اسلام کے اس عظیم المرتبت عالمِ دین، فیلسوفِ شرق، مجاہدِ عظیم الشان، محقق کبیر اور مربیِّ نسلِ نو کو ظالم و جابر طاغوتی طاقتوں نے شہید کر دیا اور آپ کے ساتھ آپ کی اس عظیم المرتبت بہن کو بھی شہید کر دیا گیا جو خود بھی ایک بہت بڑی عالمہ، فاضلہ، خطیبہ، ادیبہ اور مجاہدہ تھیں۔

آقائے شہید علیہ الرحمۃ عالمِ اسلام کی ان مایۂ ناز ہستیوں میں سے تھے جن پر صرف ملتِ جعفریہ ہی نہیں پورے عالمِ اسلام کے صاحبانِ فکر و نظر فخر کرتے تھے

اور جن کی عظیم الشان تالیفات کو اس قدر مقبولیت حاصل ہوئی کہ نہایت مختصر عرصہ میں ان کتابوں کا فارسی، انگریزی، اردو، فرانسیسی، جرمن اور دنیا کی دیگر بین الاقوامی زبانوں میں ترجمہ شائع ہوا۔

ان کتابوں نے پوری دنیا کے صاحبانِ فکر و نظر کو آپ کی عظیم المرتبت اور نابغۂ روزگار شخصیت کی طرف متوجہ کیا اور چار دانگِ عالم میں آپ کی علمی قابلیت تحقیق و جستجو اور دقیق ریزی و ژرف نگاری کی دھوم مچ گئی۔

خاص طور سے آپ کی گرانقدر تالیفات:

"فلسفتنا" اور "اقتصادنا"۔

کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی کیونکہ ان موضوعات پر نہ صرف عالمِ اسلام بلکہ پورے عالمِ عرب میں کوئی ایسی قابلِ ذکر کتاب موجود نہیں تھی۔

اوّل الذکر کتاب میں آپ نے اسلام کے فلسفۂ حیات کا دنیا کے دیگر مذاہب کے فلسفۂ حیات سے موازنہ کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ سب سے زیادہ پائیدار اور دور رس تصورِ حیات وہی ہے جسے اسلام نے پیش کیا ہے۔

اور مؤخر الذکر کتاب جو دو حصوں پر مشتمل ہے اس کی پہلی جلد میں آپ نے دنیا کے دوسرے اقتصادی نظاموں ـ سرمایہ داری اور اشتراکیت ـ کی خامیوں کو طشت از بام کرتے ہوئے ان کے مقابلے میں اسلام کے اقتصادی نظام کی عظمت و جلالت کو نمایاں کیا ہے اور دوسرے حصہ میں اسلام کے اقتصادی نظام کے بنیادی خد و خال کو نہایت شرح و بسط کے ساتھ نمایاں کیا ہے۔

اور آپ کی یہ وہ عظیم الشان دینی، علمی، فکری اور معاشرتی خدمت ہے جس پر پوری دنیائے انسانیت کی طرف سے آپ خراجِ تحسین کے حقدار تھے۔

—— لیکن افسوس صد افسوس کہ طاغوتی طاقتوں کی نگاہوں میں آپ کا وجود کھٹکنے لگا اور انھوں نے اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ ابتداءً آپ کو قید و بند میں مبتلا کر کے حق کی آواز کو دبانے کی ناپاک کوشش کی۔ لیکن جب یہ دیکھا کہ زندان کی دیواریں اس مجاہد عظیم الشان کی عظمت و رفعت کو روکنے میں ناکام ہو رہی ہیں تو آپ کو انتہائی بے دردی سے شہید کر دیا۔

"اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ"

زیرِ نظر کتاب میں بھی آقائے موصوف کی شخصیت اپنی انفرادی خصوصیات کے ساتھ نہایت نمایاں نظر آ رہی ہے۔ کتاب کے مندرجات کو پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس عظیم الشان عالمِ دین کی فکر کس قدر بلند تھی جسے انسان نما درندوں نے ہمارے ہاتھوں سے چھین لیا۔

آپ نے اس کتاب میں واضح کیا ہے کہ کسی مشکل وقت میں حالات کا گریہ کرنا کسی صاحبِ نظر کو ہرگز زیب نہیں دیتا بلکہ خود اپنا محاسبہ کرنا چاہیے کہ ان مشکلات کو ایجاد کرنے میں شعوری یا لاشعوری طور سے ہم کس حد تک حصہ دار ہیں؟ —— پھر ان اسباب و عوامل کو دور کرنا چاہیے جن کی بنا پر ہم ان مشکلات میں مبتلا ہوئے اور مستقبل کے لیے ایسی پیش بندی کرنی چاہیے کہ جن مشکلات سے ہم دوچار ہوئے ان سے آنے والی نسلیں نہ دوچار ہونے پائیں جن کے لیے خود احتسابی، خلوص، ایثار و قربانی اور جذبۂ فداکاری بنیادی شرط ہے۔ نیز اس کے بغیر کوئی قوم ایک زندہ قوم کی حیثیت سے باقی نہیں رہ سکتی۔

خدا کرے ہم آقائے شہید علیہ الرحمۃ کے ان نصائح سے درس عبرت حاصل کر سکیں کہ یہی اس کتاب کا مقصد اولین ہے۔

والسلام
سید رضی جعفر نقوی
۴ رجب ۱۴۰۶ھ

پیش لفظ

۱

اگر زیرِ نظر کتاب میں ہم "آزمائش وامتحان" کے بارے میں کچھ پیش کرنے والے ہیں، تو اے شہیدِ محترم، آقائے سید باقر الصدر (ر ح) وہ آزمائش کتنی سخت ہے جو آپ کے بعد پیش آرہی ہے۔

قوم کس قدر سختیوں اور بدبختیوں کا شکار ہے!

شفیق باپ کے سائے سے محرومی اور حرماں نصیبی کتنی شدید ہے!!

زمانے اور قضاء وقدر کے وہ ہاتھ کتنے سخت ہیں جنھوں نے آپ کو آپ کی قوم وملّت سے اس قدر جلد جُدا کر دیا جبکہ ابھی آپ نے سفر کا آغاز ہی کیا تھا۔

نہیں! ــــ نہیں!! ــــ بلکہ مجھے یوں کہنا چاہیئے کہ: ہم کتنے کم سعادت اور حرماں نصیب ہیں کہ اس قابل ہی نہیں تھے کہ آپ جیسی عظیم الشان شخصیت کے اہل ثابت ہوتے ــــ چنانچہ خداوند عالم نے یہ فیصلہ کیا کہ آپ کو

اپنی بارگاہ میں شہادت کے ذریعہ اعلیٰ مراتب پر فائز کرے اور ہم لوگ محرومی و کم نصیبی کا شکار رہیں!

اے شہیدِ عالی مرتبت!

اگر خداوند عالم نے حضرت آیت اللہ العظمیٰ آقائے سید روح اللہ خمینی مدظلہ العالی کی قیادت میں اسلامی انقلاب کی کامیابی کی صورت میں ہم پر اپنا فضل و کرم نہ کیا ہوتا تو امید کی آخری کرن بھی ہمارے دلوں میں باقی نہ رہتی۔

(بلکہ ہم ایک ایسے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بسر کر رہے ہوتے جس میں زمانے کی چیرہ دستیوں کے ساتھ ساتھ حالات سے مایوسی بھی شامل ہوتی)

اے شہیدِ محترم ——!

آج سے پندرہ سال قبل آپ نے ہم سے "آزمائش" کے موضوع پر خطاب فرمایا تھا۔ اس وقت ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ آپ کی جدائی کے بعد ہم ایک انتہائی اندوہناک آزمائش میں پڑ جائیں گے —— حقیقت تو یہ ہے کہ ہم ہر بات کے بارے میں فکر مند رہا کرتے تھے لیکن اس طرف ہمارا کبھی خیال ہی نہیں گیا اور نہ اس عظیم قومی خسارے کے بارے میں ہم نے کبھی سوچا تھا۔

ہمیں وہ وقت بھی یاد ہے۔

جب ہم آپ کے خطابِ رفیع الشان کو سننے کے لیے جمع تھے اور آپ ہمیں خبردار فرما رہے تھے کہ:

"کہیں ہمارا اندرونی اختلاف ہماری تباہی کا سبب نہ بن جائے —— کہیں ہمارا داخلی انتشار ہمیں فنا نہ کر دے۔"

آپ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ:

"ہم کب تک ایسے حالات میں زندگی گزارتے رہیں گے جو روز بروز ہمیں ہلاکت کی طرف کھینچ رہے ہیں اور ہماری تباہی کو نزدیک کر رہے ہیں۔
ہم اپنے اندرونی حالات پر کب غور کریں گے؟
اور کب ذہنی طور پر اس بات کے لیے آمادہ ہوں گے کہ (قوم وملت کے) بڑے مقاصد کی خاطر اپنے مفادات کی مختصر سی قربانی پیش کر کے اپنے اندرونی اختلافات سے چشم پوشی کر لیں"

ہم اس قسم کی نصیحتیں آپ کی زبانِ مبارک سے سنتے رہتے تھے لیکن ہمیں یہ تصور نہیں تھا کہ (اس قدر جلد آپ ہم سے جدا ہو جائیں گے اور) آپ کی شہادت کے بعد آپ کے پند و نصائح کی ہمیں اور بھی زیادہ ضرورت ہوگی۔ کیوں کہ آپ کی رحلت کے بعد تو (حق و باطل کی) معرکہ آرائی اپنی انتہا کو پہنچ گئی ہے اور جن نصیحتوں سے آپ نے ہمیں پندرہ سال قبل نوازا تھا ان کی ضرورت اب اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔

یقیناً

اب وقت آگیا ہے کہ ہم اپنے عظیم المرتبت رہنما شہید راہ خدا (آقائے سید باقر الصدر علیہ الرحمۃ) کے پند و نصائح پر بھرپور توجہ دیں اور آپ کی مثبت ہدایات جو قومی تعمیر و اتحاد اور ایثار و قربانی کے لیے بہترین مشعل راہ ہیں۔ ان پر پوری طرح عمل پیرا ہوں اور ان ہدایات کے تحت بہترین قومی و مذہبی مقاصد کو بہتر طریقے سے حاصل کریں۔

زیرِ نظر کتاب میں آقائے سید محمد باقر الصدر الشہید کے دو اہم خطبات ہیں جنہیں آپ نے مختلف اوقات میں اپنے مدرسہ کے طلاب کے سامنے پیش کیا۔

ان خطبات کا مقصد یہ تھا کہ طلاب مدرسہ کی علمی تربیت کے ساتھ ساتھ ان کے اندر اسلامی روح کو بیدار بھی کیا جائے اور ان کی ذہنی تربیت بھی کی جائے۔

کیونکہ آقائے شہید کا نظریہ یہ تھا کہ صرف فقہ و اصول کی تعلیم، اسلام کے وسیع تر مقاصد کی تکمیل کے لیے کافی نہیں ہے۔

کیونکہ فقہ و اصول کے مطالب اذہان و عقول کو تو سیراب کر سکتے ہیں مگر ضمیر و وجدان کی تشنگی دُور کرنے کا سامان فراہم نہیں کر سکتے۔

تو کہیں ایسا نہ ہو کہ طلابِ علم کے عقول و اذہان تو سیراب ہو جائیں اور ان کے ضمیر و وجدان خالی رہ جائیں۔

آقائے شہید علیہ الرحمۃ نے اپنے ان دونوں خطبوں میں "قرآن حکیم کی روشنی میں آزمائش" کے موضوع پر گفتگو فرمائی ہے۔

اور ان خطبات کی بنیادی محرک وہ قومی آزمائش ہے جن میں اہلِ عراق اُن ہی دنوں ظالمانہ بعثی حکومت کے ذریعہ مبتلا ہوئے تھے۔

اور اس وقت حالات نے ایسا رُخ اختیار کر رکھا تھا کہ لوگوں کے افکار و خیالات نہایت تشویش کا شکار تھے اور اضطراب و پریشانی نے سب کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ بعثی حکومت نے اچانک تمام غیر ملکی علماء اور طلبا کو ملک سے نکل جانے پر مجبور کر دیا تھا اور اس کے دوران بکثرت ایسے باشندگان عراق کو

بھی ملک سے نکال دیا گیا جن کے پاس نیشنلیٹی یا ڈومیسائل موجود نہیں تھی۔

اس ظالمانہ حکم سے سب سے زیادہ نجفِ اشرف کے اہلِ علم متاثر ہوئے (جو سیکڑوں برس سے اسی سرزمین میں بود و باش اختیار کیے ہوئے تھے اور اُن ہی کے وجود سے اس بابرکت مرکزِ عالم کی ان گنت رونقیں وابستہ تھیں)

ان حضرات کی جلاوطنی سے عامی مرکز کے محض انتشار و کمزوری ہی کا خطرہ نہیں پیدا ہوا بلکہ دینی رہبری کا وجود خطرے میں پڑ گیا۔

کیونکہ اسی زمانے میں مذہبی قیادت کے لیے ایک اور عظیم خطرے کی یہ بات پیش آئی کہ عراق کی ظالم بعثی حکومت نے اس وقت کے سب سے عظیم المرتبت عالمِ دین، مجتہدِ اعظم، مرجع دینی اعلیٰ حضرت آقائے سید محسن الحکیم طباطبائی علیہ الرحمۃ کے خلاف کھلم کھلا ظالمانہ اور غیر انسانی اقدامات شروع کر دیے تھے۔

اور اس دوران ایسے اندوہناک واقعات پیش آئے کہ عراق کی بعثی حکومت کی وجہ سے اس علاقہ کی تاریخ مسخ ہو کر رہ گئی اور انسانیت کی جبین عرق آلود ہو گئی۔

اور اب ہم قارئینِ محترم کی خدمت میں ان دو خطبات کو پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں جو "آزمائش کے قرآنی مفہوم" کے موضوع سے تعلق رکھتے ہیں:

آقائے سید باقر الصدر الشہید نے سب سے پہلے آزمائش کے عمومی پہلوؤں کا تجزیہ کرتے ہوئے اسے (دو حصوں پر) تقسیم کیا ہے:

① "موضوعی پہلو": یعنی وہ ماحول، حالات اور وہ تمام خارجی عوامل جو "آزمائش" کا موجب بنتے ہیں۔

② "ذاتی پہلو" یعنی جو شخص آزمائش میں پڑا ہے اس کی ذاتی صورتِ حال اور پیش آنے والی آزمائش کے بارے میں اس کا موقف۔

آقائے شہید مرحوم نے اپنے ان خطبات کے اندر آزمائش کے "موضوعی پہلو" پر گفتگو کرنے کے بجائے اپنی پوری کوشش دوسرے حصۂ آزمائش کے موقف پر انسان کے "ذاتی پہلو" کی وضاحت اور شرح وبسط میں صرف فرمائی ہے۔

چنانچہ فرماتے ہیں کہ:

"انسان کا ایک موقف تو وہ ہے جسے وہ آزمائش کے واقع ہونے کے بعد اختیار کرتا ہے اور اسی طرح آزمائش کے بارے میں اس کا شعور وادراک بھی۔
اور ایک وہ ایجابی عمل ہے جسے آزمائش کے پیش آنے سے پہلے انجام دینا ہوتا ہے۔"

ان دو خطبوں میں سے پہلے خطبہ میں آپ نے اس موقف کی وضاحت پر قلم اٹھایا ہے جو آزمائش کے پیش آنے کے بعد کے حالات سے متعلق ہے۔

چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ:

آزمائش میں پڑنے والے شخص کے شعور وادراک کی نوعیتیں مختلف ہیں:

- بعض اوقات یہ شعور بالکل شخصی قسم کا ہوتا ہے جو اپنی ذات ہی تک محدود رہتا ہے اور اپنے ذاتی مفادات کے علاوہ کسی اور بات پر انسان توجہ ہی نہیں دیتا۔
- کبھی یہ شعور طبقاتی نوعیت کا ہوتا ہے جس میں اپنے قبیلے، اپنی قوم یا اپنے خاص اہل وطن کے مفادات پیش نظر ہوتے ہیں۔
- اور بسا اوقات یہ شعور آفاقی وسعت کا حامل ہوتا ہے جس میں تمام مسلمانوں کے مفادات پیشِ نظر ہوتے ہیں اور اسلام کے عظیم مقاصد کا حصول مطلوب ہوتا ہے۔

اس سلسلہ میں عربوں اور کُردوں کی مثال پیش کرتے ہوئے آپ نے اس بات کی بہت زیادہ تاکید کی کہ ہم اپنی نگاہوں کو بلند رکھیں اور دُور تک دیکھنے کی کوشش کریں تاکہ ہمیں اندازہ ہو سکے کہ یہ جبری جلاوطنی اور لوگوں کو گھروں سے بے گھر کرنا ایک بڑی مصیبت کا پیش خیمہ بن سکتا ہے۔

ہمیں ان ذمہ داریوں کو پورا کرنا ہوگا جو اسلام کے آفاقی پیغام کی طرف سے ہم پر عائد ہوتی ہیں۔ کیونکہ دشمنانِ دین نے اسلام کے خلاف جو جارحانہ اقدامات شروع کر رکھے ہیں ان سے علمی مرکز کو سخت خطرہ لاحق ہے۔

اور اسی طرح آقائے شہید علیہ الرحمۃ نے علمی مراکز میں علمائے دین کی قیادت و رہبری کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنے پہلے خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ :

"علمی مراکز" کا یہ وجود جس کے لیے حضرات ائمہ معصومین علیہم السلام کے مقدس پیروکار اصحاب نے عظیم قربانیاں پیش کیں۔
پھر ان کے بعد ہر دور کے جید علمائے کرام اور فقہائے عظام نے نسلاً بعد نسلٍ اس کے قیام و استحکام، ارتقاء و پیش رفت اور اسے پروان چڑھانے میں اتنی قربانیاں دیں کہ اس مرکز کو پورے عالم اسلام کے لیے مشعل راہ بنا دیا۔
اور اس عظیم مقصد کے لیے ان لوگوں نے اپنا پاکیزہ وقت بھی صرف کیا۔ مقدس زندگی بھی اور اپنے طیب و طاہر خون سے بھی اس کی آبیاری کی اور جہد مسلسل کی یہ داستان اتنی طولانی ہے کہ ہماری مقدس تاریخ کے صفحات اس سے بھرے ہوئے ہیں۔

اس سلسلہ میں آپ حضرت شہید اوّل علیہ الرحمۃ کی اندوہناک شہادت کا بھی ذکر فرماتے تھے اور جناب محمد بن عمیر نے جو مصائب برداشت کیے ان کو بھی برابر یاد کرتے تھے۔

اسی کے ساتھ آپ نے اس خطبۂ اولی میں حوزۂ علمیہ (نجف اشرف) کی مختصر تاریخ بھی بیان کی ہے اور ان مختلف مراحل کا ذکر بھی کیا ہے جو اس مرکز علمی کو پیش آئے۔

مثلاً :

- مرجع دینی اور عوام الناس کے انفرادی تعلقات۔
- دینی زعامت (مرجعیت) کے مراحل۔
- مرکزیت کے ارتقائی مراحل۔
- کافرانہ طاقتوں کے مقابلے میں قوم کی قیادت کا مرحلہ۔

آقائے شہید رضوان اللہ علیہ اس بات کی بہت تاکید فرمایا کرتے تھے کہ آزمائش کے موقع پر اپنی شرعی ذمہ داریوں کا احساس نہایت ضروری ہے اور اس میں کچھ خصوصیات کا ملحوظ رکھنا نہایت اہم ہے۔

اوّل ــــــ عمومیت اور ہمہ گیری کا تصور: اس لیے کہ جو آزمائش درپیش ہے اس کا تعلق دین سے ہے اور اس پہلو سے وہ سب کے لیے شامل ہے اگرچہ وقتی طور پر تھوڑے ہی لوگوں کو نقصان پہنچ رہا ہو۔

دوّم ــــــ جب ابتلا اور آزمائش کا وقت آئے تو انسان کو ہمت نہیں ہارنی چاہیے۔

سوّم ــــــ احتسابِ نفس، کہ انسان دائمی طور پر یہ جائزہ لیتا رہے کہ کہاں کہاں اس سے کوتاہیاں سرزد ہوئیں۔

دوسرے خطاب میں آپ نے ابتلا و آزمائش کے ذاتی پہلو پر گفتگو فرمائی ہے اور کسی آزمائش کے پیش آنے میں انسان کی کارکردگی کا جو ردعمل ہو سکتا ہے اسے پیش کیا ہے اور اس سلسلے میں یہ بھی بیان فرمایا کہ آزمائش اور مصیبت کی زمین وہ ناپسندیدہ حالات ہموار کرتے ہیں جو انسانی زندگی کے طریقۂ کار اور اسلوب عمل کی شکل میں سامنے آتے رہے۔

اس فلسفیانہ بحث کو حضرت شہید علیہ الرحمۃ نے دو بنیادی عوامل پر تقسیم کیا:

اوّل ــــ خداوند عالم سے مکمل ارتباط کا احساس نہ ہونا۔

دوّم ــــ وہ نامناسب طریقۂ عمل جو اس آزمائش کے پیش آنے سے پہلے قومی سطح پر اپنایا گیا۔

جناب شہید علیہ الرحمۃ نے ان دونوں عوامل کے بارے میں بہت شرح و بسط کے ساتھ گفتگو فرمائی۔ اس سلسلے میں یوسف ابن تاشفین کی آزمائش کا بھی ذکر کیا اور ان کے طریقۂ کار کا بھی اور اس کے ساتھ یہ احساس بھی دلایا کہ خداوندِ عالم سے خصوصی ارتباط کی کس قدر زیادہ اہمیت ہے۔

اور پھر دوسرے عامل کا تذکرہ کرتے ہوئے آپ نے اس بات کی تاکید کی کہ دینی کام کو صحیح طرح انجام دینے کے لیے صالح اخلاقیات کا ہونا بے حد ضروری ہے۔ جس کے حصول کے لیے چند باتیں اساسی اور بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔

(۱) ــــ شخصی مفادات کو قومی مصلحت کی راہ میں قربان کرنے کا جذبہ۔

(۲) ــــ اسلوب عمل میں تبدیلی کی جستجو۔

(۳) ــــ معاشرتی و اجتماعی کاموں میں اجتماعی عقل و دانش سے کام لینا۔

اس طرح آپ نے آزمائش کے بارے میں اپنی منفرد اور شاہکار گفتگو دو تقریروں میں پیش کی۔ ہم ذیل میں ان کے مطالب کی فہرست پیش کرتے ہیں جو آپ نے اپنی دونوں تقریروں میں پیش کیے۔

آزمائش کا ذاتی پہلو' ـــــ آزمائش کا موضوعی پہلو' ـــــ قبل آزمائش' بعد آزمائش' ـــــ اخلاقی شعور' ـــــ آفاقی شعور' ـــــ شخصی ادراک' ـــــ قومی ادراک' ـــــ ہمہ گیری' ـــــ حوصلہ مندی' خداوند عالم سے کامل ارتباط' ـــــ ایثار و قربانی' ـــــ احتساب نفس' اسلوب عمل میں تبدیلی کا شعور و ادراک' ـــــ عقل ریاضی ـــــ عقل اجتماعی' ـــــ ماحول' ـــــ حالات، ـــــ بین الاقوامی صورت حال'

آخر میں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ میں نے آقائے شہید علیہ الرحمۃ کی ان دونوں تقاریر کا متن ٹیپ کے ذریعے حاصل کیا ہے اور اس میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی کیے بغیر اسے آپ کے سامنے پیش کر دیا ہے۔

میری طرف سے اس کتاب میں اگر کوئی اضافہ ہے تو اس کی نوعیت یہ ہے کہ:

- ـــــ کسی کسی صفحہ پر مختصر حواشی۔
- ـــــ کسی جگہ مناسبت کے لحاظ سے موضوع کی سرخی۔
- ـــــ حسب ضرورت نمبر شمار کا اضافہ۔
- ـــــ انتہائی معمولی قسم کی لفظی تبدیلیاں، جیسے کسی حرف کو بدل دینا یا کسی جملے کی تکرار ہو گئی ہو تو اسے حذف کر دینا وغیرہ۔

ہیں بارگاہ معبود میں دست بدعا ہوں کہ وہ میری اس خدمت کو قبول کرے اور استاد محترم حضرت آقائے شہید علیہ الرحمۃ کے جو حقوق مجھ پر فرض ہیں ان کی ادائیگی کا اس کتاب کو ایک حصہ قرار دے دوں۔

اسی کے ساتھ میں بارگاہِ معبود میں یہ التجا بھی کرتا ہوں کہ وہ مجھے توفیق دے کہ اس کتاب کے علاوہ آقائے شہید علیہ الرحمۃ کی جو تالیفات ہیں انھیں منظرِ عام پر لانے کی سعادت حاصل کرسکوں۔ بے شک وہ کارساز مطلق ہے اور اسی سے تمام امیدیں وابستہ ہیں۔

ناچیز
علی اکبر حائری
۱۶ر صفر ۱۴۰۴ ہجری

آزمائش

قرآن مجید میں " آزمائش " و امتحان کے بارے میں
جو ہدایات وارد ہوئی ہیں ان کے بارے ہیں حضرت
آیت اللہ سیدنا الاستاذ فیلسوفِ مشرق آقائے
سید محمد باقر الصدر الشہید (بانی تحریک انقلاب اسلامی عراق)
کی دو تقریریں :

پہلا خطاب

مورخہ ۲۶ صفر سنہ ۱۳۸۹ ہجری

آزمائش کے پہلوؤں کی تشریح

آزمائش کے پہلوؤں کی تشریح

اَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی اَشْرَفِ الْاَنْبِیَاءِ
وَالْمُرْسَلِیْنَ مُحَمَّدٍ وَّآلِهِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاهِرِیْنَ

ایک مسلمان شخص کو جس آزمائش سے بھی گزرنا پڑے اس کے دو پہلو ہیں:

① —— موضوعی پہلو
② —— ذاتی پہلو

موضوعی پہلو

موضوعی پہلو کا مطلب میرے نزدیک یہ ہے کہ وہ تمام حالات، ماحول اور وہ خارجی اسباب و عوامل جنھوں نے اس آزمائش کو ایجاد کیا اور جو انسان یا جو گروہ آزمائش میں مبتلا ہوا ہے۔ اس کے سامنے امتحان و ابتلاء کی یہ دیوار کھڑی کر دی۔

ذاتی پہلو

اور ذاتی پہلو سے میرا مقصد یہ ہے کہ جس شخص پر یہ آزمائش واقع ہوئی اس نے اس آزمائش کے نازل ہونے سے پہلے اور نازل ہونے کے بعد جو موقف اختیار کیا (وہ اس آزمائش کا ذاتی پہلو ہے) اس ذاتی پہلو کے بھی دو مرحلے ہیں۔

(۱) ـــــ آزمائش میں پڑنے والے انسان کا اس ابتلاء وامتحان میں پڑنے کے بعد اس کے بارے میں شعوری اور نفسانی ادراک کیا تھا اور اس نے اپنی حیثیت اور اپنے منصب کے لحاظ سے اس ابتلاء اور آزمائش کا مقابلہ کرنے کے لیے کیا موقف اختیار کیا۔

(۲) ـــــ یہ کہ اس شخص نے اس آزمائش میں پڑنے سے پہلے کیا مثبت کردار ادا کیا تھا اور وہ اس ابتلاء وامتحان کی ایجاد میں شعوری طور پر حصہ دار ہے یا غیر شعوری طور پر۔ اگر شعوری طور پر حصہ دار ہے تب بھی یہ دیکھنا ہو گا کہ وہ اخلاص اور حسنِ نیت کی بنا پر حصہ دار بنا ہے یا اپنی بدباطنی اور سوءِ ارادہ کی بنا پر۔

اور چونکہ ہر آزمائش کا ایک موضوعی پہلو ہوتا ہے اور ایک ذاتی پہلو ہوتا ہے اس لیے آزمائش میں پڑنے والے تمام انسانوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ موضوعی پہلو پر بھی غور کریں جس میں اس آزمائش کی مسئولیت کے تمام پہلو موردِ فکر ونظر ہوں اور اس ابتلاء وامتحان کے ذاتی پہلو پر بھی مکمل طور پر غور وفکر کریں۔

آزمائش اور امتحان کے موقع پر ان کا طرزِ زندگی ایسا ہو جائے کہ وہ آزمائش ان کی روح کی پاکیزگی، نفوس کے تزکیہ اور قلب کی صفائی کا وسیلہ بن جائے اور وہ ماضی کی ان تمام پے در پے اور متواتر سرزد ہونے والی کوتاہیوں سے توبہ کرنے کا عزمِ صمیم کرلیں جو ان کی علمی اور عملی زندگی سے وابستہ رہی ہوں ۔ یہ کوتاہیاں بعض اوقات ایسی بھی ہوتی ہیں کہ ہر شخص ان کوتاہیوں کا علیحدہ علیحدہ ادراک و احساس بھی نہیں کرسکتا۔ لیکن جب یہی کوتاہیاں اکٹھا ہو جاتی ہیں تو سب مجموعی طور پر ایک ایسے فتنے کا سبب بن جاتی ہیں جو ہر خشک و تر کو نگل لیتا ہے۔ اس سے وہ لوگ بھی متاثر ہوتے ہیں جنھوں نے حصہ لیا تھا اور وہ بھی متاثر ہوتے ہیں جنھوں نے حصہ نہیں لیا تھا کیونکہ فتنہ جب سر ابھارتا ہے تو قصوروار اور بے قصور دونوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے اور پھر بعض اوقات ہمیں کائنات کی عظیم ترین ہستیوں سے بھی ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔

غور کیجیے کہ ۴۰ھ میں جب امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام اسلام اور دین الٰہی کی خدمت کرتے ہوئے محرابِ عبادت میں شہید کر دیے گئے تو اس کے بعد بھی خود مسلمانوں ہی نے ایسی ایسی ناعاقبت اندیشیاں اور اس قدر پے در پے کوتاہیاں کیں جن کے سبب (بنی امیہ جیسے فاسق اور فاجر افراد حکومت پر قابض ہو گئے) اور یہ کوتاہیاں اس زمانے کے مسلمانوں کی غالب اکثریت سے سرزد ہوئیں۔ (جس کے نتیجہ میں نہایت مقدس اور پارسا قسم کے صاحبانِ ایمان بے جرم و خطا شہید کیے جاتے رہے) اور مسلمانوں کی رگِ حمیت بیدار نہ ہوئی بلکہ بے حسی میں اور اضافہ ہی ہوتا چلا گیا (اور جب ان کی بے حسی میں اضافہ ہوا تو ظالموں کی ہمت اور بڑھی) ان کی فتنہ انگیزی

اس حد تک بڑھی کہ وہ نواسۂ رسولؐ سید الشہدا حضرت امام حسین علیہ السلام کے خون سے اپنے ہاتھوں کو رنگین کرنے کے لیے آمادہ ہوگئے۔ (اور یہ عام مسلمانوں کی بے حسی ہی تھی کہ نواسۂ رسولؐ کے قتل کا اقدام وہ شخص کر رہا تھا جسے لوگ اس رسولؐ کا نائب اور خلیفہ قرار دے رہے تھے) اس کا واضح مطلب یہی ہوا کہ امام عالی مقام جن کی ذات والا صفات عدل کے اعتبار سے بھی اوجِ کمال پر تھی اور خالق کے عطا کردہ محاسن و کمال کے لحاظ سے بھی وہ کائنات کی بلند ترین ہستی تھے۔ حتیٰ کہ ان کا بدترین دشمن بھی ان کے دامنِ عصمت سے کسی کوتاہی کو منسوب نہیں کر سکتا، جو قول و عمل میں کائنات کے عظیم المرتبت اور منفرد شخصیت تھے۔ ان کی شہادت کے اسباب میں اس دور میں زندگی گزارنے والوں کی بے حسی کا بھی دخل ہے۔ جو یزید کے فسق و فجور سے پوری طرح باخبر ہونے کے باوجود خاموش تھے۔

جب ہم کسی آزمائش کے مرحلے سے گزریں تو ہمیں اس کی گہرائیوں میں اُتر کر اس پہلو کا بھی جائزہ لینا چاہیے اور آزمائش، امتحان و ابتلار کے وقوع پذیر ہونے کی صورت میں اپنے شعور و ادراک کو پرکھنا بھی چاہیے اور اپنے ان افعال و اعمال کا جائزہ بھی لینا چاہیے جنھوں نے اس آزمائش کے لیے زمین ہموار کی۔

یہ جائزہ ایک ایسا فوری اور ضروری فریضہ ہے جس سے ہمیں ہرگز چشم پوشی نہ کرنی چاہیے اور نہ رنج و محن کی بنا پر اس سے روگردانی کرنی چاہیے۔

ہم پر فرض ہے کہ ہم اس قسم کے تلخ اور تند حالات میں نہ رنج و غم میں مبتلا ہوں اور نہ جذباتی تاثرات کو خاطر میں لائیں۔

ہم اگر پروردگارِ عالم کی طرف سے قرآن کریم میں وارد ہونے والی ان تنبیہات پر عمل نہیں کرتے جن کے ذریعے وہ نیک و بد کے درمیان خطِ امتیاز قائم کرتا ہے

اور جو درحقیقت ان تنبیہات کے ذریعے یہ چاہتا ہے کہ توبہ و استغفار کے نئے دروازے کھول دے اور نفس کی پاکیزگی کے لیے نئی راہیں ہموار کر دے (تو اگر ہم ان تنبیہات کو پیش نظر نہیں رکھیں گے اور الٰہی ہدایات کے مطابق عمل نہیں کریں گے) تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم اس سے رحمت کے نزول کا مطالبہ کریں اور حالات کی تبدیلی کے لیے امید قائم کریں۔

اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ خداوند عالم سے سچی امید قائم کریں اور واقعاً اس کی رحمت اور امداد ہمارے شامل حال ہو، راہ حق میں صبر و استقلال کے لیے اس کی توفیق شامل حال ہو اور ہم نیکی کی طرف گامزن رہیں تو اس کی پہلی شرط یہ ہوگی کہ ہم ان الٰہی تنبیہات کے مطابق عمل کریں اپنی زندگی کو رضائے الٰہی کے مطابق قرار دیں، اپنی کتاب زندگی کے اوراق کو از سر نو پڑھیں، اپنے اعمال کا جائزہ لیں کہ ہم نے کہاں تقدیم کی ہے اور کہاں تاخیر کی ہے اور ہم سے کس کس منزل پر کیا کیا کوتاہیاں سرزد ہوتی رہی ہیں۔

آزمائش کے سلسلے میں ہمارا شعور و ادراک

قبل اس کے کہ اپنی سابقہ گفتگو کی طرف جس کو ہم نے تمہید کلام میں پیش کیا رجوع کریں۔ ہم چاہتے ہیں کہ بالکل بنیادی مسئلے سے آغاز کریں یعنی آزمائش کے بارے میں اپنے شعور و ادراک کا جائزہ لیں۔ سب سے پہلے تو یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے ادراکات کی تطہیر کریں اور آزمائش کی طرف اپنے شعور کو متوجہ کریں لیکن شرط یہ ہے کہ صحیح اسلامی شعور ہو جس کا سرچشمہ ہمارے ذاتی مفادات نہ ہوں بلکہ اسلامی حمیت ہو اور ہم انفرادی طور پر ایک ایک شخص کے وجود کی

پاسداری کرنے کے بجائے پورے اجتماعی وجود کی نگہداشت کریں۔

اس لیے کہ ایک انتہائی سخت اور اندوہناک امتحان کی گہرائیوں میں پہنچ جانے کے باوجود ہم اپنے خیالات کی تطہیر نہ کریں اور کم از کم اپنے شعور و احساس کی مثبت تبدیلی میں کامیابی حاصل نہ کریں اور ابتلاء و آزمائش کا مقابلہ کرنے کے لیے صاف ستھری شعوری طاقت ایجاد نہ کریں اور جب تک اس قابل نہ ہوں کہ اپنے نفس اور ضمیر و وجدان کے اندر ایک معمولی سا انقلاب برپا کرلیں، اس وقت تک ہم کیسے یہ امید کرسکتے ہیں کہ اپنے نفوس کی اجتماعی تعمیر کرسکیں گے اور کیسے یہ آرزو کرسکتے ہیں کہ مسلمانوں کا ایک اجتماعی معاشرہ تشکیل دے سکیں گے۔

اس لیے بنیادی گفتگو یہ ہے کہ ہم اس شعور کو پختہ کریں جس کے ذریعے آزمائش میں پڑنے والا انسان کسی بھی ابتلاء اور امتحان کا مقابلہ کرسکتا ہے۔

یہ شعور کیسے پیدا کیا جائے؟

اکثر یہ ہوتا ہے کہ ایک آزمائش پیش آتی ہے اور اس آزمائش کے نتیجے میں بہت سے خیالات پیدا ہوتے ہیں اور اگرچہ آزمائش تو ایک ہوتی ہے لیکن یہ خیالات اور تصورات اپنی وسعت اور درجات کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں۔ کیونکہ ہر شخص کے تصورات و افکار الگ ہیں اور لوگوں کے وجدان اور مقابلے کی صلاحیت میں بھی فرق ہے۔

اور ظاہر ہے کہ جب کسی مسئلے کے بارے میں لوگوں کے تصورات مختلف ہوں تو لامحالہ اس موقع پر اختیار کیا جانے والا وہ موقف بھی مختلف ہوگا جو اس پیش آنے والی آزمائش کے دفعیہ کے لیے آزمائش میں پڑنے والے افراد اختیار کریں گے کیونکہ انسان جس قسم کا تصور اس آزمائش اور ابتلاء کے

بارے میں قائم کرے گا اس کے مطابق وہ اپنے ادراکات کے مطابق اس کا مقابلہ کرنے کے لیے قدم بھی اٹھائے گا۔

کرُدوں اور عربوں کی معرکہ آرائی

قبل اس کے کہ ہم اس موضوع کی طرف قدم بڑھائیں جس کے بارے میں آپ سے گفتگو کر رہے ہیں، تقریبِ ذہنی کے لیے ایک مثال پیش کرتے ہیں۔

عراق کی سرزمین پر برسہا برس سے ایک معرکہ آرائی جاری ہے کہ شمالی علاقوں میں دو مسلمان برادران اسلحوں سے لیس ہو کر آپس میں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں اور کرُدوں اور عربوں کے درمیان سخت تنازعات جاری ہیں اور یہ وہ امتحان ہے جس سے عراق کی سرزمین دوچار ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص اس امتحان اور ابتلار کے بارے میں یہ سوچ کر رنجیدہ ہوتا ہو کہ اس ابتلار کے نتیجے میں اس کی اولاد کو تکلیف اٹھانی پڑی یا بھائیوں کو رنج پہنچا یا دوستوں کو اذیت پہنچی یا رفقار کے غم سے دوچار ہونا پڑا۔ جیسے کسی شخص کا بھائی گرفتار ہو گیا یا کسی شخص کے والد کو جیل میں ڈال دیا گیا یا دوست کو محاذ پر بھیج دیا گیا اور وہ وہاں قتل ہو گیا۔

ابتلار اور آزمائش کا یہ بھی ایک پہلو ہے اور بہت سے لوگ اسی حد تک اس کو محسوس بھی کرتے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ یہ کسی ابتلار اور امتحان کے بارے میں ایک انفرادی اور شخصی قسم کا احساس ہے جو اپنی ذات تک محدود ہے اور اس قسم کا احساس رکھنے والا انسان یہی کر سکتا ہے کہ اپنے بھائی یا اپنے والد کو بچا لے یا خود کو قانون کی گرفت سے دور رکھنے کی کوشش کرے تاکہ اس قسم کی مصیبت میں اس کا دامن نہ الجھے۔

ظاہر ہے کہ محدود قسم کا انفرادی احساس رکھنے والے حضرات نہ اس سے زیادہ کچھ سوچتے ہیں اور نہ اس کے ماورا اپنا فریضہ سمجھتے ہیں۔

اس کے برخلاف جو شخص دُور رس نظر اور گہرا احساس رکھنے والا ہے وہ اس امتحان اور ابتلاء کو انفرادی سطح پر نہیں دیکھتا بلکہ وطن کی اساس پر دیکھتا ہے کہ ایک ہی علاقے کے لوگ ایک دوسرے سے جنگ کر رہے ہیں اور معرکۂ کارزار گرم کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کسی امتحان اور آزمائش کے بارے میں اگر اس قسم کا شعور اور احساس ہوگا جو پورے اہلِ وطن سے متعلق ہو تو ایسے موقع پر انسان جو موقف اختیار کرے گا وہ اوّل الذکر انفرادی موقف سے بلند اور وسیع تر ہوگا۔ کیونکہ انسان یہ سوچے گا کہ وہ کس طرح اس علاقے کے لوگوں کے درمیان امن و آشتی اور اخلاص و محبت کی فضا قائم کرے۔

اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان کے تصورات اور بھی وسیع اور بلند ہوتے ہیں اور وہ اس قسم کی ابتلا اور آزمائش کو محض انفرادی یا علاقائی سطح پر نہیں پرکھتا بلکہ زیادہ گہری نگاہ سے دیکھتا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ ان لوگوں پر یہ بلا اس لیے نازل ہوئی ہے کہ انھوں نے مسلمان ہوتے ہوئے خداوندِ عالم کی بھیجی ہوئی شریعت کے مطابق زندگی گزارنے سے انحراف کیا ہے، اور شریعت سے یہی انحراف اس بات کا سبب بنتا ہے کہ دو بھائیوں (کرد و عرب) کے درمیان اختلافات اتنے گہرے ہو گئے جو ایک بڑا مسئلہ بن گئے اور کردوں کی عربوں سے جنگ شروع ہو گئی۔

ظاہر ہے چونکہ یہ احساس اوّل الذکر اور ثانی الذکر احساسات سے مختلف ہے۔ کیونکہ پہلا احساس انفرادی اور ذاتی تھا اور دوسرا علاقائی اور وطنی، جبکہ یہ تیسرا احساس وہ ہے جس کا سرچشمہ اللہ کی شریعت ہے جو سب

کو حاوی ہے۔ اس لیے ایسا احساس رکھنے والا شخص جو موقف اختیار کرے گا وہ انفرادی اور علاقائی احساسات رکھنے والے شخص کے موقف سے مختلف ہو گا۔ کیونکہ یہ شخص اسے دین و شریعت کا غم سمجھتا ہے اور اس اختلاف اور معرکہ آرائی کے اصل سبب تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

وہ آزمائش جس سے ہم دوچار ہیں

اسی طرح وہ امتحان اور آزمائش جس میں ہم مبتلا ہیں[1] اس کے بارے میں بھی لوگوں کے احساسات جداگانہ ہو سکتے ہیں۔ ایک شخص جسے ملک چھوڑ دینے کا حکم دیا گیا وہ یوں بھی سوچ سکتا ہے کہ وہ راحت اور آسائش کی زندگی سے محروم ہو گیا اور وہ آرام و سکون جو اسے میسر تھا وہ چھن گیا اور اب وہ رنج والم اور پریشان حالی کی زندگی سے دوچار ہے۔ جس میں وہ خود بھی مبتلا ہے اور مرکزِ علمی کے بہت سے حضرات بھی جنھیں اسی قسم کی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ کیونکہ

---

[1] یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیے کہ حضرت آقائے سید محمد باقر الصدر علیہ الرحمۃ نے یہ خطبہ اس وقت دیا تھا جب ایک طرف عراق کے شمالی علاقوں میں کردوں کی عربوں سے لڑائی ہو رہی تھی اور دوسری طرف کربلائے معلیٰ، نجف اشرف اور عراق کے دیگر مقدس شہروں سے اہل ایمان کو لاکھوں کی تعداد میں ملک بدر کیا جا رہا تھا اور چونکہ اس ملک بدری کے قانون میں کوئی استثنیٰ نہیں تھی اس لیے کئی ہزار طلبا اور علمائے دین کو بھی ان مقدس مقامات کو چھوڑنا پڑا جس کی وجہ سے علمی مراکز زوال و انحطاط کا شکار ہوئے اس لیے آقائے سید باقر الصدر الشہید نے دونوں باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔

جس ملک میں وہ زندگی گزار رہے تھے وہاں کے لوگوں نے انھیں جلا وطن کر دیا اور ملک چھوڑنے پر مجبور کر دیا اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ اس آزمائش کو ایک انسان اس نقطۂ نگاہ سے سوچتا ہے کہ اس سے شہر کا امن وسکون تہ وبالا ہو گیا تو ظاہر ہے کہ یہ شخص امن وسکون کو تلاش کرے گا۔

لیکن یہ بھی واضح ہے کہ اس قسم کا محدود شخصی احساس کسی معاشرے کی حقیقی تعمیر میں اساسی حیثیت نہیں رکھتا۔ کیونکہ اس احساس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان اس ابتلاء و امتحان کو اپنی ذات کے ساتھ ایک محدود تعلق کی بنیاد پر محسوس کر رہا ہے۔

اور جب اس نے صرف شخصی حد تک محسوس کیا ہے تو اگر انفرادی طور پر اس کے سر سے یہ بلا ٹل جائے تو پھر اسے اس ابتلاء اور آزمائش کا احساس بھی باقی نہ رہے گا اور نہ ان لوگوں کے بارے میں اسے کوئی پریشانی ہو گی جو اس مصیبت میں مبتلا ہیں۔ (کیونکہ اس نے صرف اپنے عیش و راحت کو سوچا تھا تو اگر اپنا عیش و راحت بحال ہو جائے تو اس مصیبت کا احساس بھی ختم ہو جائے گا) اور پھر انسان اس مصیبت کی آمد کا احساس بھی نہ کر سکے گا۔ اور وہ دوسرا شخص جو ان ہی لوگوں کے گروہ میں شامل ہے جنھیں جلا وطنی کی مصیبت برداشت کرنی پڑ رہی ہے اور اس جلاوطنی کو امن وسکون کی بربادی سمجھ رہا ہے وہ بھی صرف اس حد تک اس جلاوطنی کو مصیبت سمجھے گا کہ اس کی وجہ سے شہر کا امن وسکون غارت ہو گیا۔ لہٰذا اس کو بھی سب سے پہلی فکر یہی ہو گی کہ وہ اس بد امنی کے ماحول سے نکل جائے اور اس کے لاشعور میں یہ جذبہ پوشیدہ ہو گا کہ جب اس سرزمین پر امن وسکون اور اطمینان کی زندگی میسر نہیں ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک ایسی جگہ منتقل ہو جائیں جہاں امن وسکون کی حالت اطمینان بخش ہے تو پھر یہ شخص اس جگہ جانے میں

کیوں تاخیر کرے گا اور کیوں نہ جلد از جلد اس سرزمین کو چھوڑ دے گا تاکہ امن و سکون کا مسئلہ حل ہو جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک منفی طرز فکر جو اس حوزۂ علمیہ میں زندگی گزارنے والے بعض حضرات کے ذہن میں اس ابتلاء و آزمائش کے بارے میں پایا جاتا ہے اور وہ احساس محرومی و بے پائی جو بعض لوگوں کے خمیر میں داخل ہو چکا ہے ان سب کا سرچشمہ درحقیقت وہ انفرادی شعور اور شخصی ردعمل ہے جو ہر شخص اس ابتلاء و آزمائش کے بارے میں رکھتا ہے۔

کیونکہ جب آزمائش کے بارے میں اس انداز سے سوچا جاتا ہے کہ اس کے ذریعہ سکون تہ و بالا ہو گیا اور اس کی وجہ سے اطمینان ختم ہو گیا تو جو انسان ذاتی طور پر بے اطمینانی کا شکار نہ ہوا ہو اسے اس ابتلاء و آزمائش کے بارے میں فکر بھی نہیں ہوتی اور آزمائش سے دوچار ہونے والا شخص بھی عام طور پر صرف یہ سوچتا ہے کہ وہ کسی ایسی جگہ چلا جائے جہاں ابتلاء و آزمائش نہ ہو۔

یہ انداز فکر ان تمام لوگوں کا ہے جو کسی بھی ابتلاؤ آزمائش کے موقع پر محدود طریقے سے متاثر ہوتے ہیں اور صرف شخصی مفادات کے بارے میں سوچتے ہیں۔

لیکن اگر ہمارے احساسات اور ہمارا رنج و الم انفرادی سطح سے بلند ہو صرف اور صرف خدا کے لیے ہو تو ہمارا طرز فکر یکسر مختلف ہوگا اور ہم یہ سوچنے پر مجبور ہوں گے کہ ابتلاو آزمائش محض یہ نہیں ہے کہ ہماری پرسکون زندگی رہا اعیش و آرام خطرے میں پڑ گیا۔ سوچیے حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کی وفات حسرت آیات کے بعد آج تک وہ کون سا لمحہ ایسا گزرا ہے جب ہم نے عیش و راحت کی زندگی گزاری ہو۔ حضور اکرمؐ جو اس قوم کے رہبر اعظم تھے جنہوں نے شب و روز کی جد و جہد اور عظیم قربانیوں کے ذریعے اس قوم کو جادۂ استقامت پر گامزن کیا۔ ان کی رحلت کے وقت یہ قوم ابھی ابتدائی منزلوں میں تھی کہ ہر قسم کے مصائب و آلام، ابتلاء و آزمائش کا شکار ہو گئی اور پھر اس دن سے کسی مومن کو راحت نصیب نہ ہو سکی۔

کیا حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے اس آزمائش کے بارے میں جو آنحضرتؐ کی وفات کے بعد پیش آئی یہ نہیں فرمایا ہے:

"الفتنة التي يشيب فيها الوليد"

"یہ وہ فتنہ ہے جس میں بچے بوڑھے ہو جائیں گے"

تو کیا وہ زندگی جو بچّوں کو بوڑھا کر دے امن و سکون کی زندگی ہو سکتی ہے؟

فرق یہ ہے کہ بہت سے لوگ نہ امن و سکون کے معنی کو سمجھتے ہیں اور نہ اس کے فقدان کا احساس کرتے ہیں۔ بے چینی موجود رہتی ہے لیکن کچھ لوگ اس قدر تساہل پسند ہوتے ہیں کہ وہ جب تک کسی بڑی مصیبت میں مبتلا نہ ہو جائیں انھیں ابتلاء و آزمائش کا احساس ہی نہیں ہوتا۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم لوگ سیکڑوں برس سے ابتلاء و آزمائش کی زندگی گزار رہے ہیں اور ایک حسّاس انسان کے نقطۂ نگاہ سے کسی بھی جگہ امن و سکون نام کی کوئی چیز نہیں ہے بشرطیکہ ہم امت مسلمہ کے حالات کو مولائے کائنات امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے عظیم المرتبت قلب سلیم کی روشنی سے دیکھیں جنھوں نے فرمایا تھا کہ:

"یہ وہ فتنہ ہے جو بچّوں کو بوڑھا کر دے گا۔"

جو شخص اس نقطۂ نظر کو سامنے رکھے گا اسے دنیا میں نہ سکون نظر آئے گا نہ اطمینان۔ بلکہ زندگی مشکلات اور احساسِ فرض سے بھری نظر آئے گی جس میں ہر لمحہ مقابلے اور جدوجہد کی ضرورت ہے اور اگرچہ ظاہری زندگی کے اسباب کتنے ہی فراواں ہوں، اسے شعوری طور پر زندگی میں امن وسکون نہیں نظر آسکتا۔

اصل بات یہ ہے کہ ہم اس وقت زندگی کے آرام وسکون سے محروم نہیں ہوئے کیونکہ حقیقی امن وسکون سے تو اسی دن محروم ہو گئے تھے جس دن آنحضرتؐ نے رحلت فرمائی اور اگر اس دنیا میں کوئی مردِ مسلمان وقتی طور پر امن وسکون محسوس بھی کرتا ہے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ کسی ابتلاء وآزمائش سے نہیں گزرا۔ نہ اس نے رنج ومحن میں لوگوں کا ساتھ دیا اور نہ اس نے اس احساسِ فرض کو ملحوظ رکھا جو اس پر عائد تھا۔ کیونکہ جس کا امامؑ یہ کہہ رہا ہو کہ یہ وہ آزمائش ہے جس میں بچہ بوڑھا ہو جائے گا۔ اس میں پھر اس مومن کو امن وسکون کیسے نصیب ہو سکتا ہے۔ لہٰذا وفاتِ رسولِ مقبولؐ کے بعد آج تک نہ ہمیں کسی وقت امن وسکون نصیب ہوا تھا اور نہ اس وقت ہم اس سے محروم ہوئے ہیں بلکہ صرف امتحان اور ابتلاء کا عنوان بدلا ہے ورنہ امت اسی طرح آزمائش میں ہے جس طرح سیکڑوں برس سے دوچار رہی ہے اور اپنے وجود کو باقی رکھنے کے لیے ائمہ کرام علیہم السّلام کے مقدس اور باکردار چاہنے والوں نے بے پناہ کوششیں کی ہیں اور ان کے بعد ہر دور کے فقہا نے نسلاً بعد نسلٍ قوم کے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے، اسے پائیدار بنانے کے لیے اور اسے آگے بڑھانے کے لیے بہت قربانیاں دیں۔ یہاں تک کہ عالمِ اسلام کے تمام اطراف میں اس امت کو اصلاح کا روشن نمونہ بنا دیا اور اس عظیم مقصد کے لیے

اپنا مقدس خون بھی دیا۔ قیمتی وقت بھی صرف کیا اور زندگیوں کا نذرانہ بھی پیش کیا جن کی تفصیلات سے تاریخ کے اوراق پُر ہیں۔ لہٰذا اس وقت مسئلہ یہ نہیں ہے کہ فلاں شخص کو نقصان سے کیسے بچایا جائے یا فلاں فرد کی کیسے حفاظت کی جائے بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ پوری امت کے اس اجتماعی وجود کو کیسے برقرار رکھا جائے۔

اور امت کا یہ روحانی وجود ہم تک قربانی کے بغیر نہیں پہنچا ہے کہ ہم یہ سوچیں یا احساسِ شکست و پسپائی کی بنا پر یہ فرض کر لیں کہ ہم اسے سہولت کے ساتھ سپرد کر دیں گے یا ہم اپنی مرضی سے خود ہی اپنے اختیارات کو سلب کر لیں یا اپنے ہی ہاتھوں سے اسے برباد کر دیں بلکہ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے' قوم وملت کا یہ روحانی وجود جو صدیوں پر محیط ہے اس کی تاریخ قربانیوں سے بھری ہوئی ہے اور عملِ صالح اور جہادِ مسلسل سے گونج رہی ہے۔ اس قوم کے وجود کے بارے میں جس پہلو سے بھی غور کیا جائے گا رنج والم کی طویل داستانیں نظر آئیں گی۔ ان داستانوں میں محمد ابن ابی عمیر کی عظیم داستان بھی ہے اور ان جیسے سیکڑوں مجاہدین راہِ خدا اور اصحاب ائمہ طاہرین علیہم السلام کی داستانیں بھی جنھوں نے ہر قسم کی آزمائش وابتلا کو برداشت کیا قربانیاں پیش کیں اور اپنے قومی وجود کو تاریخ میں ثبت کرنے کے لیے ہر قسم کی پریشانیوں کو قبول کیا۔

محمد ابن ابی عمیر کی آزمائش

ہم جو اس وقت پسپائی کا شکار ہو رہے ہیں تو ہمیں یہ سوچنا چاہیے اور غور کرنا چاہیے کہ ہمارے اسلاف نے ایسی عظیم قربانیاں پیش کی ہیں جن میں محمد ابن ابی عمیر کی داستان ہمارے معاشرے میں مشہور اور معروف ہے۔

یہ وہ بزرگ ہیں جنھوں نے عظیم قربانی دی اور ثبات قدم کا عظیم مظاہرہ کیا

نہ صرف یہ کہ انھوں نے نفسانی خوف پر غلبہ حاصل کیا بلکہ اس زمانے کے سب سے بڑے حکمران کی طرف سے ان پر جو بے پناہ مظالم ہوئے انھیں بھی نہایت خندہ پیشانی سے قبول کیا۔ چونکہ یہ اس زمانے کے مشہور ترین شیعہ علماء اور فقہاء میں سے شمار کیے جاتے تھے اور شیعوں کے تمام نمایاں افراد سے باخبر تھے اور اس زمانے کا بادشاہ شیعوں کا بہت بڑا دشمن تھا۔ اس نے آپ سے یہ فرمائش کی کہ مجھے شیعوں کے تمام نمایاں افراد کی فہرست فراہم کر دیجیے تو آپ کو کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔

آپ نے بادشاہ کی اس پیش کش کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ جس پہ بادشاہ کی طرف سے پھر مطالبہ ہوا اور جب اس نے بہت زیادہ اصرار کیا تو آپ نے فرمایا کہ:

"میں شیعوں میں سے صرف محمد ابن ابی عمیر، محمد ابن ابی عمیر، محمد ابن ابی عمیر ہی کو پہچانتا ہوں۔"

بادشاہ کی طرف سے آپ کو جلادوں کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ انھوں نے پھر یہی سوال کیا کہ اور کس شیعہ کو پہچانتے ہیں تو فرمایا:

"محمد ابن ابی عمیر کو ..."

انھوں نے پھر پوچھا اور کس کو۔ تو فرمایا محمد ابن ابی عمیر کو ... یہانتک کہ جتنی مرتبہ یہ سوال کیا آپ نے یہی جواب دیا جس کی وجہ سے طیش میں آکر ان ظالموں نے آپ کو اتنا مارا کہ آپ بے ہوش ہو گئے (جب ہوش میں آئے تو ظالموں نے پھر مارنا شروع کیا)۔

محمد ابن ابی عمیر کہتے ہیں کہ:

"جب مجھ پر بے پناہ ظلم ہو رہا تھا اور ستم گر ہر طرف سے مجھے مار رہے تھے تو ایک لمحہ کے لیے میرے اندر ایک

کمزوری پیدا ہوئی اور میں نے سوچا کہ اپنی زبان کھولوں اور حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے شاگردوں میں سے اور اپنے بھائیوں اور اپنے ساتھیوں میں سے کچھ لوگوں کے نام بتا دوں۔ ابھی میں نے یہ سوچا ہی تھا کہ مجھے ایسا محسوس ہوا گویا (عالم خیال میں) میرے مرحوم شفیق استاد آقائے حمران رحمۃ اللہ علیہ میرے سامنے کھڑے ہیں اور مجھ سے فریاد کر رہے ہیں کہ محمد ابن ابی عمیر! خبردار شیعوں کے بارے میں ایک لفظ بھی نہ کہنا چاہے اس کے بدلے تم پر اتنے کوڑے پڑیں کہ موت واقع ہو جائے"۔

محمد ابن ابی عمیر کہتے ہیں کہ:

"اس کے ساتھ ہی میری عزیمت اور قوت فکر وعمل عود کر آئی اور میں نے اپنے قلب کی بھرپور توانائیوں کے ساتھ یہ فیصلہ کر لیا کہ میں شیعوں کے بارے میں ہرگز کوئی بات نہیں کہوں گا چاہے اس کے بدلے مجھے کتنی ہی سختی برداشت کرنی پڑے"۔

چنانچہ جلاد آپ کو مارتے رہے اور آپ خاموش رہے۔ یہاں تک کہ وہ آپ کو مارتے مارتے تھک گئے مگر آپ کی مُہرِ خاموشی کو توڑ نہ سکے۔ جب آپ کا جسم تقریباً بے جان ہو گیا تو آپ کو اٹھا کر آپ کے گھر پہنچا دیا گیا اور پھر آپ کا تمام مال واسباب حکومت نے ضبط کر لیا۔

چونکہ آپ عالمِ دین ہونے کے ساتھ ساتھ بہت بڑے تاجر بھی تھے اس لیے آپ کے پاس بہت زیادہ مال واسباب تھا۔ حکومتِ وقت نے آپ

کی ساری دولت ضبط کرلی اور بیک جنبشِ قلم آپ کو ایسا فقیر و محتاج بنا دیا جو ایک ایک پیسے سے محروم ہو چکا تھا۔

لیکن آپ نے ان مصائب و آلام پر اُف بھی نہ کی اور گھر کے ایک گوشے میں بیٹھ کر احادیث معصومین اور روایاتِ ائمہ طاہرین کی تالیف و تدوین میں مصروف ہو گئے۔

ظالموں نے جب آپ کے گھر کو لوٹا تو آپ کی تصنیف و تالیف سے متعلق کاغذات اور کتابوں اور ہر قسم کے مخطوطات کو بھی لوٹ لے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ جناب ابن ابی عمیر کی جو روایات ہمیں موصول ہوئی ہیں ان میں راویوں کا ذکر نہیں ہے۔ اربابِ علم کا بیان ہے کہ اس عظیم المرتبت عالم دین کی اکثر روایتوں کے مرسل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ آپ کی کتابیں بھی آپ کے گھر کے مال و اسباب کے ساتھ لوٹ لی گئی تھیں۔ چنانچہ اس حادثے کے بعد جب آپ تدوین و تالیفِ کتب میں مصروف ہوئے تو احادیث کو صرف اپنے حافظے کی مدد سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا اور چونکہ ان میں سے اکثر احادیث کے راویوں کے سلسلۂ نسب آپ کے ذہن میں محفوظ نہیں تھے اس لیے آپ نے انھیں مرسل رکھا[1]

یہی وجہ ہے کہ جناب ابن ابی عمیر کی اکثر روایتیں مرسل ہیں (اور فقہا کی زبان سے یہ جملہ کثرت سے استعمال ہوا ہے کہ ابن ابی عمیر کی مرسل احادیث بھی مُستند احادیث کے مانند ہیں)

---

[1] علم حدیث کی اصطلاح میں مرسل اس حدیث کو کہتے ہیں جس کے راویوں کا سلسلہ سند مکمل اور مسلسل نہ ہو بلکہ بیچ سے ٹوٹ گیا ہو۔

آپ کا معمول یہ تھا کہ گھر کے گوشہ میں بیٹھے رہتے اور جو احادیث آپ کے حافظے میں موجود تھیں ان کو صفحہ قرطاس پر منتقل کرتے رہتے۔ دشمنوں کے مظالم کا نہ کوئی خیال تھا نہ احساس بلکہ بھرپور ثباتِ قدم اور جرأت و استقامت کے ساتھ آپ اس دینی خدمت میں مصروف رہے اور چونکہ انھیں یقین تھا کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا طرزِ حیات ہی وہ صحیح راستہ ہے جس کی پیروی ایک شائستہ انسان بننے کے لیے واجب ہے اس لیے وہ پوری استقامت کے ساتھ اس پر گامزن رہے اور جو کچھ ممکن تھا اس راہ میں قربانی پیش کی جیسا کہ ایک باشعور انسان کو کرنا چاہیے۔

ان پر کتنی ہی آزمائشیں پڑیں لیکن نہ وہ گھبرائے نہ مضطرب ہوئے اور نہ اپنے پیشوا حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی تعلیمات و ہدایات کی طرف سے ایک انچ بھی انحراف کیا۔

(آئیے دیکھیں کہ یہ شخص جس کا سارا مال و اسباب ظالموں نے لوٹ لیا تھا لیکن اس کے باوجود اس کا دل کتنا قوی تھا اور وہ ائمہ کرامؑ کے ارشادات پر کس قدر سختی سے عمل پیرا تھا)

مشہور ہے کہ جس وقت جناب ابن ابی عمیر تجارت کرتے تھے اس زمانے میں ایک شخص نے ان سے کچھ کپڑا خریدا تھا لیکن اس کی قیمت ادا نہیں کر سکا تھا اور اس طرح جناب کا مقروض چلا آرہا تھا۔ پھر جب اس نے لوگوں سے یہ سنا کہ جناب محمد ابن ابی عمیر مصائب و آلام کا شکار ہو گئے ہیں اور حکومت نے ان کا تمام مال و اسباب ضبط کر لیا ہے تو وہ شخص ان کا قرض ادا کرنے آیا اور کہنے لگا۔

"اے میرے محترم بزرگ! میں معذرت چاہتا ہوں کہ مجھے آپ کی رقم ادا کرنے میں اتنی تاخیر ہوئی اور اس تاخیر کی وجہ یہ تھی کہ میں تنگدستی کا شکار تھا لیکن جب

میں نے یہ سُنا کہ حکومت نے آپ کا مال و اسباب ضبط کر
لیا ہے اور آپ مشکلات کا شکار ہو گئے ہیں تو میں نے یہ
طے کیا کہ اپنا گھر بیچ دوں۔ چنانچہ میں نے گھر بیچ دیا اور آپ
کی واجب الادا رقم لے کر اپنے قرض کی ادائیگی کے لیے حاضر
ہوا ہوں تاکہ آپ اپنی رقم لے لیں اور اس سے اپنا کام چلائیں۔"

آپ جانتے ہیں کہ اس مردِ بزرگ نے جو خود بھی ایک بلند مرتبہ فقیہ تھا اور
امام جعفر صادق علیہ السلام کے مدرسے کا عظیم شاگرد تھا کیا کہا؟

(جب اس قرض دار نے اپنے قرض کی ادائیگی کے لیے اپنا گھر بیچا اور
اس کی رقم لے کر جناب ابن ابی عمیر کے پاس آیا جن کے تمام مال و
اسباب کو حکومت نے ضبط کر لیا تھا اور یہ محتاج ہو چکے تھے اور وہ
شخص بھی انھیں کے اس مال کو لے کر آیا تھا جو اس کے ذمے بطور
قرض باقی تھا لیکن اس شریف النفس انسان اور ائمہ معصومینؑ کی
درسگاہ کے پروردہ فقیہ اور عالم دین نے فرمایا)

"میں نے اپنے آقا اور مولا حضرت امام جعفر صادقؑ
کا یہ فرمان سنا ہے کہ "قرض کی ادائیگی کے لیے رہائشی
مکان نہیں بیچا جائے گا" اے شخص تو اپنا یہ مال واپس
لے جا میری فکر نہ کر اس لیے کہ اللہ بہترین رزق فراہم کرنے
والا ہے۔"

غور کیجیے کہ جناب ابن ابی عمیر انتہائی سخت اور پریشان کن حالات میں مبتلا تھے
لیکن اس کے باوجود انھوں نے یہ پسند نہ کیا کہ ایک انچ بھی ان تعلیمات اور اخلاقی

ہدایات سے ہٹیں جو ان تک حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی طرف سے پہنچی تھیں (وہ جانتے تھے کہ) امام جعفر صادق علیہ السلام کا یہ جو فرمان ہے کہ:

"قرض کی ادائیگی کے لیے رہائشی مکان نہیں بیچا جائے گا"

اس کا مطلب یہ ہے کہ قرضخواہ کے لیے یہ سزاوار نہیں ہے کہ وہ قرض دار کو اپنا رہائشی مکان بیچنے پر مجبور کرے لیکن اگر وہ اپنی مرضی سے اپنا مکان فروخت کردے تو قرض خواہ کے لیے شرعاً جائز ہے کہ وہ اپنا حق قبول کر لے لیکن حدیث کے الفاظ سے کراہت کا اظہار ضرور ہوتا ہے اور اسی کراہت کے مفہوم نے اس عظیم انسان کو جو خود ابتلا و آزمائش میں مبتلا تھا یہ موقف اختیار کرنے پر آمادہ کیا کہ اس نے قرض کی رقم وصول کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ اس کی زندگی کا نصب العین صرف یہ تھا کہ وہ ایک اعلیٰ مثال قائم کردے کہ مرد مسلمان کو اپنے اخلاق اپنے سلوک اور اپنی سیرت و کردار میں کیسا ہونا چاہیے۔

ہمارے علمی مرکز (حوزۂ علمیہ) کے وجود میں محمد ابن ابی عمیر اور ان جیسے مخلص، خداترس اور وفاشعار انسانوں کی عظیم الشان قربانیوں کی ان گنت داستانیں پوشیدہ ہیں۔

مراحل
جنھیں اس علمی مرکز نے طے کیا

① ـــــ انفرادی روابط کا مرحلہ ② ـــــ مرجعیت کے نظام کا مرحلہ

③ ـــــ مرکزیت اور ہم آہنگی کا مرحلہ ④ ـــــ قیادت و رہبری کا مرحلہ

ہمارے اس حوزۂ علمیہ کی ایک طویل تاریخ ہے اور اس دوران یہ متعدد مراحل سے گزرا ہے :

ا۔ پہلا مرحلہ ـــــ انفرادی روابط

اس مرحلے میں حوزۂ علمیہ کا وجود درحقیقت ان انفرادی روابط کا نام تھا جو علماء و مجتہدین اور ان کے شہروں میں زندگی گزارنے والے عوام الناس

کے درمیان استوار تھے۔ علمار دین سے مسائل پوچھے جاتے تھے اور ان کا وہ جواب دیتے تھے۔ یہ روابط انفرادی شکل میں قائم تھے جن کی ایک کڑی وہ عالمِ دین ہوتا تھا جو فتویٰ دینے کا اہل ہو اور دوسری کڑی وہ مومنین تھے جو ان سے کسبِ فیض کرتے تھے۔ اس مرحلہ کا آغاز حضراتِ ائمہ طاہرین علیہم السلام کے شاگردانِ خاص سے ہوا اور حضرت علامہ حلی علیہ الرحمۃ کے زمانے تک برقرار رہا۔ کیونکہ حضرت علامہ حلی کے زمانے تک صورت حال یہ تھی کہ ہر علاقے میں جو علمار و مجتہدین موجود ہوتے تھے ان سے اس علاقے کے مومنین دینی مسائل دریافت کرتے تھے جن کا وہ جواب دیا کرتے تھے۔

(اس لحاظ سے ہر علاقے میں علمار دین اور صاحبانِ ایمان کے جو روابط تھے وہ انفرادی سطح پر تھے)

۲۔ دُوسرا مرحلہ ——— مرجعیت کا نظام

واقعات اور حالات کی روش اور رفتار کو سامنے رکھتے ہوئے جو کچھ میں سمجھ سکا ہوں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مرجعیت کے مرحلے کا آغاز جناب شہید اوّل علیہ الرحمۃ کی زندگی میں ہوا۔[1]

یہ وہ بزرگ ہیں جنھوں نے حوزۂ علمیہ کے وجود و بقا کے سلسلے میں اپنے خون کا نذرانہ پیش کیا۔ آپ ہی کے بابرکت دور میں مرجعیت کا نظام

---

[1] ان کا اسم گرامی محمد ابن شیخ جمال الدین مکی عاملی ہے انھیں ۹ جمادی الاول ۷۸۶ھ میں پنجشنبہ کے دن شہید کیا گیا اور دشمنانِ دین نے آپ کے جسدِ مبارک کو آگ میں جلا دیا۔

قائم ہوا جس میں اطراف وجوانب میں علمائے دین بحیثیت وکیل مجتہد کے بھیجے جاتے تھے جو ان جگہوں پر مقامی مومنین سے بھی رابطہ قائم رکھتے تھے اور مرجع دینی سے بھی ان کا رابطہ قائم رہتا تھا۔ جیسا کہ اس وقت بھی اس کی شکل موجود ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ تاریخی لحاظ سے اس کا آغاز جناب شہید اول کے دست مبارک سے ہوا۔

آپ نے لبنان اور شام وغیرہ میں اس کو عملی جامہ پہنایا اپنے نمائندے مقرر کیے جو مومنین سے شرعی قواعد کے مطابق خمس وزکوٰۃ وصول کرتے تھے اور دینی کاموں پر خرچ کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے علماء کی تاریخ میں پہلی مرتبہ شیعوں کا ایک مستحکم دینی رابطہ اپنے مرجع وقت سے قائم ہوا۔

آپ کا یہ تاریخی اقدام (اس وقت کے حکمرانوں کی نگاہوں میں کھٹکنے لگا اور بالآخر) آپ کی شہادت کے اسباب میں سے ایک اہم سبب قرار پایا۔[1]

۳۔ تیسرا مرحلہ ــــــ مرکزیت اور ہم آہنگی

دوسرا مرحلہ جسے ہم نے مرجعیت کے نام سے یاد کیا ہے وہ شہید اوّل کے زمانے سے اس وقت تک برقرار رہا ہے۔ البتہ شیخ محمد حسین کاشف الغطار کے زمانے میں اس حوزۂ علمیہ کا تیسرا مرحلہ شروع ہوا ہے۔ جسے ہم مرکزیت

---

[1] آپ کی شہادت کی داستان طویل ہے جس کے ذکر کی یہاں گنجائش نہیں ہے البتہ آپ کے حالات زندگی پر مشتمل متعدد کتابوں میں ان تفصیلاً کو دیکھا جا سکتا ہے جن میں سے مشہور ترین کتاب روضات الجنات ہے جو قم کی سرزمین پر ۱۳۹۲ھ میں شائع ہوئی۔

اور ہم آہنگی کا مرحلہ قرار دے سکتے ہیں کیونکہ دوسرے مرحلے میں اگرچہ مرجعیت پائیدار بنیادوں پر قائم تھی لیکن اس کی حیثیت ایک ایسے مرکز کی نہیں تھی جو دنیا بھر کے تمام شیعوں کو محیط ہو لیکن جناب شیخ محمد حسین آل کاشف الغطاء اور ان کے معاصرین کے زمانے میں جب عراق و ایران کے روابط اور تعلقات بہت وسیع ہوئے تو اس بات کا امکان پیدا ہوا کہ عالم تشیع میں ایک مرکزیت کی بنیاد رکھی جائے چنانچہ اس زمانہ کا بلند مرتبہ مرجع دینی عالم اسلام کی نگاہوں کا مرکز قرار پایا۔

اس عظیم مقصد کے لیے اور اس ارتقاء و پیش رفت کے لیے جناب شیخ محمد حسین اور ان کے معاصرین نے بہت جانفشانی بھی کی اور عظیم قربانیاں بھی دیں جن کی تفصیلات بیان کرنے کا موقع نہیں ہے۔ (کیونکہ ہم نہایت اختصار کے ساتھ ان مراحل کو بیان کرنا چاہتے ہیں جن سے یہ علمی مرکز گزرتا ہوا موجودہ مرحلے تک پہنچا)

اس تیسرے مرحلے میں مرجعیت نے ایک طویل داستان عثمانی سلطنت کے زمانے میں رقم کی۔ یہ وہ وقت تھا جب یہ علاقہ سامراجی طاقتوں کی دستبرد سے محفوظ تھا۔

۴۔ چوتھا مرحلہ ـــــ قیادت و رہبری

جب عالم اسلام پر سامراجی طاقتوں کا حملہ ہوا تو اس کے نتیجہ میں جہاں پورے معاشرہ میں تبدیلیاں پیدا ہوئیں وہاں اس مرکز میں بھی کچھ تبدیلیاں پیش آئیں۔ اس وقت تک یہ مرکز پورے عالم تشیع کے لحاظ سے ایک اہم حیثیت اختیار کر چکا تھا اور چونکہ دنیا بھر کے شیعوں کی قیادت اسی

مرکز کے پاس تھی۔ اس لیے کافر سامراجی طاقتوں سے اس کی معرکہ آرائی بدیہی تھی چنانچہ اس مرکز نے ان طاقتوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کے مفادات کی نگرانی کی اور ان کی طرف سے دفاع کیا جس کی وجہ سے اس کی مرکزیت میں اور اضافہ ہوا کیونکہ لوگوں کو اس کی رہبری اور رہنمائی پر اور اعتماد پیدا ہوا۔ چنانچہ تقریباً پچاس ساٹھ برس قبل اس علاقہ میں عراق، لبنان اور دیگر ممالک میں سامراجی طاقتوں نے اثر و رسوخ پیدا کر کے لوگوں کو اپنے نظامِ حکومت کے مطابق چلانا چاہا تو یہی دینی قیادت تھی جو اگرچہ اس وقت نشیب و فراز سے گزر رہی تھی اور اس کی زندگی مد و جزر کا شکار تھی لیکن اس کے باوجود اس نے اپنے حالات اور امکانات کے مطابق قومی رہنمائی کے فریضہ کو انجام دیا۔

ہمارے علمی مرکز کی یہ وہ تاریخ ہے جس کو ہم نے چار مرحلوں میں آپ کے لیے پیش کیا اور ہمارے علماء نے جن قربانیوں کے ذریعہ اس کے وجود کو باقی رکھا ان کی طرف مختصر طور سے اشارہ کیا۔ تو کیا یہ ممکن ہے کہ اگر یہ مرکز کسی ابتلاء اور آزمائش میں پڑے تو اس کے ذمہ دار حضرات کا شعور اور ادراک بھی عام انسانوں کے شخصی اور محدود انفرادی احساسات جیسا ہو اور وہ بھی صرف یہ سوچیں کہ ہمارا امن و سکون ختم ہو گیا۔ ہم زندگی کی آسائشوں سے محروم ہو گئے اور امن و امان رخصت ہو گیا۔ کیا یہ شعور اور ادراک کسی ایسے شخص کا ہو سکتا ہے جو محمد ابن ابی عمیر کا ورثہ دار ہو اور شہید اوّل کی جانشینی کا شرف رکھتا ہو جنھوں نے اس راہ میں اپنی جان قربان کی۔

کیا اتنے عظیم المرتبت اشخاص کا نائب و جانشین اس ابتلاء کے بارے میں عام انفرادی تاثرات جیسا شعور اور ادراک کر سکتا ہے۔ کیا اسے بھی صرف

مالی نقصانات یا امن و سکون کی بربادی کا صدمہ ہو سکتا ہے۔

نہیں، ہرگز نہیں ——— بلکہ لازمی طور پر ایسے شخص کو جو احساس ہوگا وہ اپنی ذمہ داریوں کے لحاظ سے ہوگا۔ جس کا واضح نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ شخص جب سوچے گا تو سب کے بارے میں سوچے گا اور اس کے تاثرات اور اس کا رنج وغم اس مرکز سے وابستہ تمام لوگوں کے بارے میں ہوگا۔ نہ یہ کہ صرف ایک فرد کے بارے میں وہ رنجیدہ ہو۔ کیونکہ ظلم وستم کی اس آگ کی لپیٹ میں صرف کوئی ایک شخص نہیں آئے گا بلکہ اس مرکز کا پورا وجود متزلزل ہوگا۔ لہٰذا اس مرکز سے وابستہ تمام لوگوں کا شعور اور ادراک بھی خصوصی ہوگا۔ ان کے احساسات بھی منفرد ہوں گے اور ان کے تاثرات بھی سب سے الگ ہوں گے۔

ان میں سے ہر شخص کو یہ بات ضرور پیش نظر رکھنا چاہیے کہ اگر کسی انسان کا داہنا ہاتھ کٹ جائے تو بائیں ہاتھ کے لیے اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ وہ یہ سوچے کہ میں تو امن وامان میں ہوں مجھے تو نہیں کاٹا گیا۔ اس کا ایسا سوچنا اس لیے ناممکن ہے کہ ایک ہاتھ کٹ جانے سے کارکردگی پر بہرحال اثر پڑے گا اور جس کام کو دونوں ہاتھ مل کر انجام دیتے تھے وہ نہ ہو سکے گا۔ اب یہ اور بات ہے کہ انسان اس بات کو فوراً محسوس کرے یا کچھ دیر بعد۔

ہمارے اس مرکز کا مسئلہ بھی ایسا ہی ہے جیسے ایک جسم یا ایک وجود کا مسئلہ ہوتا ہے۔ لہٰذا اس مرکز سے وابستہ تمام حضرات کو ایک انداز سے ہی اس کا ادراک کرنا چاہیے۔

پھر وہ لوگ جو براہ راست حادثات سے دوچار ہوئے ہیں انھیں بھی ہمت نہیں ہارنی چاہیے اور امن وامان سے محرومی کی اس صورت میں اپنی ہمتوں کو شکست وریخت سے بچانا چاہیے۔ انھیں ایسا نہ سوچنا چاہیے کہ اس سرزمین

کو چھوڑ کر دوسری سرزمین کی طرف چلے جانے سے مسئلہ حل ہو جائے گا۔

اگر باقی لوگ بھی اس سرزمین کو چھوڑنے لگیں تو مسئلہ حل نہیں ہوگا بلکہ اس مرکز کا وجود خطرہ میں پڑ جائے گا اور گویا اس طرح سے یہ لوگ اضطراری نہیں بلکہ اختیاری طور پر اس مرکز کو کمزور کرنے کا سبب بنیں گے جس سے اسلام اور مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچے گا۔

یہ شہر، یہ سرزمین وہ ہے جہاں اسلام کی برکت سے آپ مالا مال ہوئے دین و مذہب کے وسیلے سے آپ کو اور ہمیں رزق ملا اور اس نے ہمارے بوجھ کو برداشت کیا۔ اس لیے حقیقت یہ ہے کہ ہمارا وجود بھی اسلام کا مرہونِ منت ہے۔ ہمارے اموال، ہماری عزت، ہمارا شرف اور جو کچھ بھی ہمارے پاس ہے اسلام کا ہی عطا کردہ ہے اور ہمارا ہر بُنِ مُو دین و مذہب کا احسان مند ہے لہٰذا اگر یہی ہم سے مطالبہ کرے کہ ہم ہفتہ دو ہفتہ یا مہینہ دو مہینہ دشمنوں کے مظالم کو برداشت کریں خدا کی راہ میں تکلیفیں اٹھائیں اور صبر و استقامت کا مظاہرہ کریں تاکہ یہ مرکز کمزور نہ ہونے پائے اور اس کا وجود خطرے میں نہ پڑے اور اس وقت تک صبر و سکون کا مظاہرہ کریں جب تک اسلام اور مسلمانوں کے ابتلاء و آزمائشوں کا زمانہ ختم نہ ہو جائے۔

اگر اسلام ہم سے اس بات کا مطالبہ کرتا ہے تو یہ مطالبہ نہ غیر قانونی ہے اور نہ غیر فطری ہے۔ کیونکہ ہمارا دین و مذہب ہی ہمارا وہ محسن ہے جس کے فیوض و برکات سے ہم ہمیشہ مالا مال ہوتے رہے۔ اس کا فضل و کرم ہم پر جاری رہا۔ یہ ہماری ہمیشہ حفاظت کرتا رہا اور ہم اس کی برکت سے ہر قسم کی رحمتیں و برکتیں اور عزت و شرف حاصل کرتے رہے۔

اگر دین نہ ہوتا تو ہماری کیا عزت تھی کیا اعتبار تھا۔

اسلام ہی ہے جس کے ذریعہ ہمارے اندر طاقت اور شوکت ہے ہم اس کے ذریعہ صدیوں قومی حیثیت سے زندہ رہے اور دین ہی کی برکت سے مومنین کے دلوں میں ہمیں مرکزیت نصیب ہوئی۔ ہم میں سے ہر شخص کو سوچنا چاہیے کہ لوگوں کے دلوں میں اس کا جو بھی اثر و نفوذ ہے وہ اسلام ہی کی بنا پر ہے اور جو بھی ہماری عزت کرتا ہے وہ اسلام کی ہی بنیاد پر کرتا ہے۔

اے میرے بھائیو! آپ اسلام کے عوض کوئی معمولی قیمت قبول نہ کریں لیے وقتی مفادات پر قربان کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے اور نہ وقتی پریشانیوں کی بنا پر ملک چھوڑنے کا کوئی جواز ہے۔ سوائے اس کے کہ انسان کا شعور اور ادراک محدود ہو اور اس کے احساسات محض شخصی مفادات تک منحصر ہوں۔

اے پالنے والے ہمارے دلوں کو ایمان کی طاقت سے مستحکم فرما۔

اے پالنے والے ہمیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس عطا فرما۔

اے پالنے والے اپنی مدد و نصرت ہمارے شامل حال فرما۔

اے پالنے والے ہمیں یہ توفیق دے کہ اس امتحان اور آزمائش کے موقع پر ہمارے احساسات تیرے ان مومن اور صابر بندوں جیسے ہوں جو ابتلاء اور آزمائش کے موقع پر خوشنودئ خدا کے لیے کامل ثباتِ قدم کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

اے پالنے والے تاریخ کی یہ حقیقت ہمیشہ ہمارے پیشِ نظر رہے کہ جنگِ خندق میں جب حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام عمرو ابنِ عبدوَد کو قتل کرنے کے لیے اس کے سینہ پر سوار ہوئے اور اس نے آپ کے ساتھ بدتمیزی کی جس سے آپ کو غصہ آیا تو آپ تھوڑی دیر کے لیے رُک گئے تاکہ

اپنا غیظ و غضب ختم ہو جائے اور اس دشمن خدا کو صرف خوشنودی خدا کی نیت سے قتل کریں۔

اے پالنے والے یہ واقعہ ہمیشہ ہمارے پیش نظر رہے تاکہ ہم ذاتی رنج والم کو پیش نظر رکھنے کے بجائے اللہ کی رضا کے طلب گار رہیں۔ ہماری فکر اسلام کے مصالح کے مطابق ہو، اپنے مفادات کی تابع نہ ہو اور ہمارا شعور و ادراک ہمہ گیر ہو شخصی اور انفرادی نہ ہو۔

سرزمینِ عراق پر کمیونزم کا سُرخ طوفان

جب سے عراق کی سرزمین پر کمیونزم کا سرخ طوفان آیا ہے، میں نے ہزاروں مرتبہ اس کے بارے میں اپنے نفس سے سوال کیا کہ میں جو اس طوفان سے انتہائی رنجیدہ ہوں اس کا سبب یہی تو ہے کہ عراق کے لوگوں کے کمیونسٹ بن جانے کا خطرہ ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر عراق کے بجائے یہ خطرہ ایران میں پیدا ہو جاتا یا عراق و ایران کے بجائے پاکستان اس خطرہ سے دوچار ہوتا یا یہ کہ مسلمانوں کے بڑے بڑے ممالک میں سے کسی اور ملک میں اسی قسم کا طوفان سر اٹھاتا، تو کیا اس صورت میں بھی مجھے اتنا ہی رنج پہنچتا جیسا رنج و غم اس وقت ہے۔

میں بار بار اپنے ضمیر و وجدان سے یہی سوال کرتا رہتا ہوں۔

تاکہ مجھے اپنے رنج و غم کی نوعیت کا صحیح اندازہ ہو سکے اور میں یہ سمجھ سکوں کہ عراق میں کمیونزم کا طوفان آنے سے جو مجھے رنج و غم پہنچا ہے وہ شخصی مفادات کے حوالے سے یا دینی غیرت و حمیت کے سبب سے؟

کہیں ایسا تو نہیں کہ مجھے ڈر ہو کہ کمیونزم آنے سے میری دال روٹی متاثر ہو گی ؟ !!

یا میرا مرتبہ کم ہو جائے گا ؟ !!

یا میری شخصیت کا وقار باقی نہ رہے گا ؟ !!

کیونکہ میرے ذاتی مفادات بھی تو اسلام سے وابستہ ہو سکتے ہیں کہیں ایسا تو نہیں کہ مجھے وہ ذاتی مفادات خطرے میں نظر آرہے ہیں - اس لیے میں رنجیدہ ہوں کیونکہ اگر ایسا ہوا تو مجھے عراق پر کمیونسٹوں کے حملہ سے جو رنج پہنچے گا وہ اس رنج و غم سے زیادہ ہوگا جو ایران، پاکستان یا کسی اور اسلامی ملک پہ کمیونسٹوں کے حملہ سے پہنچ سکتا ہے ....

لیکن اگر میرا رنج و غم صرف خدا کی خاطر ہو اور مجھے یہ فکر ہو کہ اللہ کی سرزمین پر صرف اس کی عبادت ہونا چاہیے اور اگر میں دل کی گہرائیوں سے اس بات کا خواہشمند ہوں کہ لوگ دین سے برگشتہ نہ ہوں تو میری نظر و فکر عراق و ایران یا پاکستان یا اور کسی ملک کی سرحدوں تک محدود نہیں رہے گی بلکہ میری زندگی کا گوہرِ مقصود عالم اسلام کے مفادات ہوں گے اور جب بھی اسلام کو کوئی خطرہ درپیش ہوگا تو مجھے شدید رنج و غم لاحق ہوگا - چاہے وہ خطرہ عراق میں پیدا ہو یا ایران میں یا پاکستان میں یا کسی اور مسلم ملک میں -

احتسابِ نفس

ہم میں سے ہر شخص کا یہ فرض ہے کہ وہ دوسروں کا محاسبہ کرنے سے پہلے اپنے نفس کا محاسبہ کرے اور اسے جو رنج و غم پہنچا ہے اس کے بارے

میں اچھی طرح غور کرے کہ اس کے تاثرات اس کے ذاتی مفادات کی بنا پر ہیں یا خوشنودیٔ خدا کی خاطر؟

تو اگر اسے یہ محسوس ہو کہ اسے جو رنج و غم پہنچا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ اس کے شخصی مفادات خطرہ میں پڑ گئے ہیں تو پھر اس شخص کو خدا کی خوشنودی کی فکر چھوڑ دینی چاہیے اور یہ امید نہ رکھنا چاہیے کہ بارگاہِ معبود میں اجر و ثواب رکھا ہوا ہے۔ کیونکہ اس کا رنج و غم اپنے لیے ہے، تو جب اس کا رنج و غم اللہ کی خاطر ہے ہی نہیں تو وہ اللہ سے اجر و ثواب کیوں چاہتا ہے اور کس بات کا ثواب چاہتا ہے۔

ایسا شخص تو دنیا میں رحمت یا حالات کی بہتری اور آخرت میں اجر و ثواب میں سے کسی کا بھی حقدار نہیں ہے!!

البتہ اگر انسان اپنے نفس کا محاسبہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس کا رنج و غم حقیقتاً اور واقعاً صرف اللہ کی خاطر ہے اور وہ درحقیقت اس بات سے رنجیدہ ہے کہ اللہ کی سرزمین پر اللہ کی نافرمانی کیوں ہو رہی ہے تو ایسے شخص کی فکر و نظر میں یقیناً وسعت ہو گی۔ وہ تمام مسلمانوں کو ایک نگاہ سے دیکھے گا اور پورے عالمِ اسلام کی مشکلات کو ایک انداز سے محسوس کرے گا۔

آج دینی مرکز اور مذہبی قیادت کو اگر کچھ مصائب درپیش ہیں تو اس سے پہلے بھی اس پر بہت سے مصائب و آلام گزرے ہیں۔ اس نے بہت سی آزمائشوں کو برداشت کیا اور برسہا برس سے بڑے بڑے رنج و محن سے دوچار ہونا پڑا ہے۔

لیکن سوچیے کیا وہ تاثرات جو اِن مصائب و آلام کی بنا پر پیدا ہوئے

اور آج اس مذہبی قیادت کو جو مصائب و آلام درپیش ہیں ان سے متاثر ہونے میں ہمارا انداز ایک ہی جیسا ہے ؟

وہ شخص جس کی زندگی صرف خدا کی خاطر ہو۔ وہ ان تمام مصائب و آلام اور ہر رنج و محن کے بارے میں ایک انداز سے متاثر ہوگا چاہے طوفان کا رخ براہ راست اس کی ذات کی طرف ہو یا اس کے بھائی کی طرف ہو یا اس کے کسی برادرِ دینی کی طرف ہو۔

اگر ان آزمائشوں کے موقع پر ہمارے احساسات مختلف ہیں اور ہم ان تمام مراحل میں ایک جیسا رنج و غم محسوس نہیں کرتے تو ہم میں سے ہر ایک کو اپنے نفس کا علاج کرنا چاہیے تاکہ ہماری زندگی صرف اللہ کی خاطر ہو اور ہم سب کو اللہ کی مغفرت و رحمت حاصل ہو سکے۔

دوسرا خطاب

مورخہ ۲۷ صفر سنہ ۱۳۸۹ ہجری

ابتلاء و آزمائش کا قرآنی مفہوم

ابتلا و آزمائش کا قرآنی مفہوم

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی اَشْرَفِ الْاَنْبِیَآءِ
وَالْمُرْسَلِیْنَ مُحَمَّدٍ وَّ آلِہِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاہِرِیْنَ۔

امّا بعد

سابقہ گفتگو میں ہم نے یہ بات پیش کی تھی کہ قرآن مجید میں ابتلاء و آزمائش کے بارے میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ جو قوم کسی آزمائش و امتحان میں مبتلا ہو اسے اس ابتلاء و آزمائش سے تعلق رکھنے والی ذمہ داریوں کو بھی قبول کرنا چاہیے۔ مثلاً جب دنیا میں فتنہ و فساد پھیلتا ہے تو اس کے بارے میں قرآن مجید

کا فرمان یہ ہے کہ :

"ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ ....."

"یہ فساد جو خشکی و تری میں ظاہر ہوا یہ درحقیقت نتیجہ ہے لوگوں کی ان بداعمالیوں کا جن کے وہ مرتکب ہوئے اور اب دوسرے لوگوں کو ان کا مزا چکھنا پڑ رہا ہے۔"

لہٰذا ابتلاء و آزمائش درحقیقت ایک ہولناک شکل ہے ان ہی اعمال کی جنھیں سابق لوگوں نے انجام دیا۔

جیسا کہ ارشاد قدرت ہے :

"وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ۔"

یہ آیت انسانی کارکردگی کے برُے نتائج سے باخبر بھی کر رہی ہے اور عبرت و نصیحت کا درس بھی دیتی ہے اور اسی بنا پر ہم نے کہا تھا کہ کسی بھی آزمائش کا ذاتی پہلو بھی یہی ہے کہ ہم سب سے پہلے اس آزمائش کے بارے میں اپنے شعور و احساس کا جائزہ لیں (جیسا کہ اس کی طرف گزشتہ تقریر میں توجہ دلائی)

اور اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اپنے نفس کا محاسبہ کریں، اپنے عمل کا جائزہ لیں، اس بات پر غور کریں کہ آزمائش کی ایجاد میں خود ہم نے (لاشعوری طور پر) کتنا حصہ لیا ہے۔

اسلوب عمل کے نفسیاتی پہلو

ہم اس وقت اس طریقِ کار کے بارے میں کوئی بحث نہیں کرنا چاہتے جس کی بنا پر یہ آزمائش پیدا ہوئی ہے اور نہ ان طریقوں کے بارے میں گفتگو کرنا چاہتے ہیں جن کا قہری نتیجہ حالات کی بدتری کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ بلکہ سب سے پہلے اس نفسانی کیفیت کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جو ایسے موقع پر ابتلاء اور آزمائش کے لیے زمین ہموار کرتی ہے۔ کیونکہ بلا و مصیبت کی زمین ان نفسانی حالات نے ہموار کی ہے جن سے ہم ایک طویل مدت سے گزر رہے ہیں۔

اور ظاہر ہے کہ یہ ایسے صالح حالات نہ تھے جن سے صالح نتائج برآمد ہوتے اور اچھے پھل ظاہر ہوتے۔

بلکہ یہ نفسانی حالات جن سے ہم ماضی میں بھی گزرتے رہے ہیں اور اس دور میں بھی دوچار رہے ہیں۔ ہماری راہوں میں برابر مشکلات پیدا کرتے رہے اور ہمیں متعدد امتحانات میں مبتلا کرتے رہے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ انھیں دو بنیادی نفسیاتی عوامل پر تقسیم کیا جاسکتا ہے اور اگرچہ ظاہری نگاہوں میں یہ دو عوامل نظر آتے ہیں لیکن یہ دونوں عوامل ایک دوسرے سے مکمل طور سے مربوط ہیں۔

(۱) ——— خداوندِ عالم سے مکمل اور بھرپور رابطہ کا احساس نہ ہونا۔

(۲) ——— ہمارے معاشرہ کی اخلاقی حالت وہ نہیں ہے جو ایک با عمل انسان کی ہونا چاہیے۔ بلکہ درحقیقت ہماری حالت ان (تساہل پسند) انسانوں جیسی ہے جو کسی صحیح عمل کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے۔

اگر ہم اس آزمائش سے کچھ سبق حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اپنے نفس کے محاسبہ میں سچے ہیں تو ہمیں ان دونوں بنیادی عوامل پر بھرپور توجہ دینا چاہیے تاکہ ہم ماضی میں پیش آنے والے واقعات کو اچھی طرح سمجھ بھی سکیں اور ہمیں یہ احساس بھی ہو کہ مذکورہ بالا دونوں عوامل (یعنی خداوند عالم سے ارتباط کامل کا شعور و بے عملی انسان کی کیفیت) کا صحیح ادراک کرسکیں۔

۱۔ خداوندِ عالم سے ارتباطِ کامل کے احساس کا فقدان

جہاں تک پہلے عامل کا تعلق ہے یعنی خدا سے ارتباطِ کامل کا فقدان۔ تو یہ عام طور سے ان طالب علموں کی زندگی میں بھی نظر آتا ہے جنھوں نے اپنے شہروں سے رختِ سفر باندھا اور ہمیشہ کے لیے یہاں آگئے۔ انھوں نے غریب الوطنی بھی برداشت کی، سفر کی زحمتیں بھی اٹھائیں، تنہائی سے بھی دوچار ہوئے اور دوستوں، گھر والوں اور اہلِ وطن سے بھی جدا ہوئے۔

ان تمام زحمتوں کا احساس طالب علموں کو ابتدا میں تو بہت ہوتا ہے اور وہ اپنے پروردگار سے ارتباط کامل کا ادراک بھی کرتے ہیں اور انھیں یہ شعور بھی رہتا ہے کہ یہ اللہ کی محبت ہی ہے جس کی کشش نے ان کو اپنے خاندان، اپنے وطن اپنے شہر اور اپنے احباب سے جدا کر کے یہاں پہنچایا تاکہ خوشنودی خدا کی طرف قدم بڑھائیں —— اور وہ علماء جو انبیاء کے وارث ہیں ان سے علم حاصل کریں۔ تاکہ یہ بھی ان ہی کے راستہ پر چل سکیں۔

لیکن جب طالب علم اس تفصیلی شعور و ادراک کے ساتھ اس علمی مرکز میں آکر اس کی موجوں میں شامل ہوجاتا ہے، اس کے منہاج کو اپنا لیتا ہے اور اس راستہ پر چلتے چلتے وہ گویا انھیں حالات کا عادی ہوجاتا ہے تو پھر رفتہ رفتہ اس کی

آتشِ عشق ومحبتِ الٰہی ہلکی ہونے لگتی ہے، حالانکہ اس کے شعلوں میں اور بھی التہاب پیدا ہونا چاہیے تھا۔ لیکن تدریجاً شوق میں اضافہ کے بجائے اور کمی ہو جاتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ طالب علم حوزۂ علمیہ میں آجانے کے بعد جب پُرسکون زندگی گزارنے لگتا ہے تو گھر سے نکلنے کے بعد عالمِ سفر میں اللہ کی طرف جو بھرپور توجہ تھی وہ برقرار نہیں رہتی کیونکہ وہ ایک پرسکون ماحول میں ایک مقرر راستہ کو طے کرتے ہوئے کچھ معین درس پڑھتا رہتا ہے اور (چونکہ اس کی زندگی ایک پرسکون ماحول میں بسر ہوتی ہے اور وہ فکر والم سے دوچار نہیں ہوتا۔ اس لیے) رغبت الی اللہ کو مہمیز کرنے والی صورت حال پیدا نہیں ہوتی، جس کے نتیجہ میں اس کا قلب اور ضمیر و وجدان ایک خلا سے دوچار ہوجاتا ہے اور نفس کا یہ عظیم خلا فقہ واصول کی گوناگوں اصطلاحات سے تو پُر نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ فقہ و اصول کے مطالب عقل وشعورِ انسانی کے لیے تو غذا فراہم کرتے ہیں لیکن ضمیر و وجدان تو اس کے علاوہ کچھ اور بھی مطالبہ کرتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ (صرف فقہ واصول پڑھنے والے کی) عقل وشعور تو علوم اور معارف سے مالامال ہوتی ہے لیکن وہ قوت جسے ضمیر و وجدان کہا جاتا ہے (اگر اس کی صحیح طریقے سے آبیاری نہ ہو تو) وہ اسی تشنگی کی حالت پر رہتا ہے جس پر اپنے گاؤں میں تھا یا ابتدائی درس میں تھا، یا اس ماحول میں تھا جس سے نکل کر یہاں آیا۔

ضمیر و وجدان کا یہ خلا بعض اوقات اس شعور وادراک کی قوت کو مزید کمزور کردیتا ہے جس قوت کے سہارے انسان اپنے ارتباط باللہ کو تقویت دے سکے۔ ایسی صورت میں انسان اگرچہ عقل وفکر کے اعتبار سے بہت بلند مرتبہ پر فائز ہو، لیکن یہ شعور نہ فکری اعتبار سے پروان چڑھے گا نہ عملی اعتبار سے اسے تقویت

ملے گی۔ کیونکہ اس کا واسطہ محض انہی نظریات سے پڑتا ہے جو احکام شرعی کی تحقیق اور استنباط سے مربوط ہوں اور ظاہر ہے کہ وہ نظریات جن کی بنا پر حکم شرعی کی تحقیق کی جائے۔ وہ عقل و فکر کی غذا تو ہیں لیکن ضمیر و وجدان کی غذا نہیں ہیں۔

اور عمل کے اعتبار سے اس شعور کو تقویت اس لیے نہیں ملتی کہ یہ طالب علم زندگی میں ایسے تجربات سے گزرتا ہی نہیں کہ خدا سے اس کا ارتباط پروان چڑھے۔ یہ طالب علم درس و بحث کی زندگی تو گزارتا ہے لیکن عملی زندگی کے تجربات سے دور ہوتا ہے اور جو شخص صرف درس و بحث کی زندگی گزارے (اور عملی تجربات سے دور ہو گا وہ) ایسے ماحول میں ہو گا جو اللہ سے قربت کے جذبہ کو مہمیز نہیں کر سکتا۔

بعض اوقات انسان کی زندگی گناہ سے آلودگی کے سبب خوشنودیٔ خدا سے محروم ہو جاتی ہے اور اس کا ارتباط ختم ہو جاتا ہے اور اگر اسی حالت میں کچھ زمانہ گزرے تو شعور و ادراک کی روشنی بجھ جاتی ہے۔

ہوتا یہ ہے کہ شروع میں تو یہ رغبت اور ارتباط جو بہت قوی تھا (عملی تجربات نہ ہونے کے سبب) صرف کمزور ہوتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ دوسرے عوامل و اسباب کی بنا پر یہ شعور اور بھی مخفی ہو جاتا ہے۔

یہ اسباب کبھی تو ماحول کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں کبھی معاشرے کی بنا پر کبھی حالات کی بنا پر اور کبھی سماج کے نامناسب اندازِ فکر کی بنا پر۔ یہ غیر فطری اور ناہموار اسباب پے در پے اس طرح پیش آتے ہیں کہ خدا سے ارتباط کا پاک و پاکیزہ شعور دب کر رہ جاتا ہے۔ پھر اگر کچھ اور زمانہ اسی طرح گزرے تو وہ شعور اور بھی کمزور ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ کمزور ہوتے ہوتے نئی شکل اختیار کر لیتا ہے

جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ طالب علم جو اپنی علمی زندگی کے طویل مراحل کو طے کر چکا ہے اور درس و تحقیق کے اعتبار سے اب اس قابل ہو چکا ہے کہ اپنی عملی زندگی کا آغاز کرے اور بالفاظ دیگر اس مرحلے تک پہنچ چکا ہے کہ اسے دینی خدمت میں شریک ہونے کی دعوت دی جائے۔

اس کا ضمیر و وجدان، شوق و رغبت کی اس حیثیت پر بھی باقی نہیں رہتا جو اسے گھر سے اس مرکز کی طرف آنے کے وقت مہمیز کر رہی تھی۔ وہ آرزوئیں اور وہ خیالات اور وہ تمام عظیم تصورات جو اس مرکز کی طرف آتے وقت اس کے ذہن میں پروان چڑھ رہے تھے وہ سب رائیگاں ثابت ہوئے کیونکہ ان میں جمود پیدا ہو گیا اور وہ ایسے مجمل احساسات بن گئے جن کی کسی جانب سے آبیاری نہیں ہوئی۔ چنانچہ وہ رفتہ رفتہ کمزور ہو گئے اور اسی کو کہتے ہیں ’خدا فراموشی‘۔

اور جب انسان خدا کو فراموش کر دیتا ہے تو پھر اللہ بھی اس کی حالت پر توجہ نہیں دیتا۔ جیسا کہ محاورہ بھی ہے کہ جو اللہ سے کٹ گیا اس سے اللہ بھی کٹ گیا اور خدا کا فرمان ہے کہ اس کی طرف مکمل طور پر اگر متوجہ ہو جاؤ تو کسی اور کی طرف متوجہ ہونے کی حاجت نہیں رہتی۔

(بلکہ وہی تمھارے سارے مسائل کو حل کر دے گا کیونکہ وہ کارساز حقیقی بھی ہے اور قادر مطلق بھی۔)

ہماری حالت آج یہ ہے کہ ساری دنیا ہم سے ناراض نظر آتی ہے جس کی بظاہر وجہ یہی ہے کہ ہم نے خدا سے اپنے ارتباط کو اتنا قوی نہیں بنایا کہ اس کی خصوصی عنایات کے مستحق قرار پاتے۔ ہم نے اپنی عملی زندگی میں یہ احساس ہی نہیں کیا کہ ہمیں اللہ سے بھرپور قوی ارتباط پیدا کرنا چاہیے۔ جبکہ ہماری یہ ذمہ داری تھی کہ اس کی ذات سے وابستگی کو مستحکم بنانے کے لیے اپنی تمام

صلاحیتوں اور توانائیوں کو صرف کرتے لیکن چونکہ ہم نے اس کے لیے کوشش نہیں کی اس لیے اس کی خصوصی توجہات کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکے جس کے نتیجہ میں باطل قوتوں کی ریشہ دوانیوں سے اپنے کو محفوظ رکھنے کے لیے ہمیں کوئی وسیلہ نظر نہیں آتا۔

یاد رکھیے ہم میں سب سے بہتر وہی ہے جو خدا سے وابستگی کو مضبوط بنانے کے لیے پوری توجہ سے کام لے کیونکہ اگر یہ وابستگی کامل ہو گئی تو ساری مشکلات حل ہو جائیں گی۔ ورنہ اس سے ہٹ کر جو کوشش بھی کی جائے گی وہ صرف شخصی اور انفرادی حد تک نتیجہ خیز ہو سکتی ہے۔ (جبکہ خدا سے وابستگی کے ذریعہ سارے مسائل حل ہو سکتے ہیں) کیونکہ وہی وہ ذات عظیم ہے جس کے قبضۂ قدرت میں آسمان و زمین ہے اور وہی تمام قوتوں کے مقابلے میں ہماری حفاظت کرنے والا ہے۔

یاد رکھیے، حضرات ائمہ طاہرین سلام اللہ علیہم اجمعین کو اپنے زمانے کے سلاطین کی طرف سے انتہائی ہولناک مصائب برداشت کرنا پڑے اور ان کے دور کے حکام نے انھیں ہمیشہ ابتلا و آزمائش میں رکھا کیونکہ ان حکام و سلاطین کا پورا نظام حکومت ظلم کی بنیادوں پر قائم تھا اور ان کی تمام پروپیگنڈا مشنری اہلبیت طاہرین کے خلاف استعمال ہو رہی تھی۔ وہ تقریباً نوے برس تک عالم اسلام کے تمام منبروں سے اہلبیتؑ کے خلاف نازیبا کلمات کہتے رہے۔ ان کے اثر و نفوذ کو معاشرے سے ختم کرنے کے لیے اپنے تمام وسائل کو استعمال کرتے رہے اور لوگوں کے دلوں سے ان کی عقیدت و محبت کو کم کرنے کے لیے ہر قسم کے ہتھکنڈے استعمال کرتے رہے لیکن اس کے باوجود تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جب امام زین العابدین علیہ السلام، ہشام ابن عبدالملک کے زمانے میں حجر اسود کا بوسہ لینے

کے لیے خانۂ خدا میں آئے تو اگرچہ یہ وہ دور تھا جس میں منبروں سے انھی امام علیہ السلام اور ان کے آباؤ اجداد کو گالیاں دی جارہی تھیں لیکن اس کے باوجود جب آپ نے حجر اسود کی طرف قدم بڑھایا تو مجمع کائی کی طرح پھٹتا چلا گیا اور آپ کے لیے حجر اسود تک پہنچنا آسان ہو گیا۔ جبکہ یہ لوگ کسی بھی بڑے سے بڑے حکمران یا بادشاہ کے لیے راستہ دینے پر تیار نہیں ہوتے تھے۔ خود ہشام نے اس بات کی بہت کوشش کی تھی کہ وہ حجر اسود تک پہنچ جائے لیکن مجمع نے اسے جگہ نہیں دی اور وہ ایک گوشہ میں کھڑا ہو کر انتظار کرتا رہا اور اسی اثنا میں جب امام عالی مقامؑ تشریف لائے تو پورے مجمع نے دل کی گہرائیوں سے آپ کا استقبال کیا اور حجرِ اسود تک آسانی سے پہنچنے کے لیے راستہ دیا۔

سوچیے! اس کی وجہ یہی تو تھی کہ امامِ عالی مقامؑ کی اپنے پروردگار سے وابستگی اتنی قوی تھی کہ اس کے گھر تک پہنچنے سے کوئی طاقت آپ کو روک نہیں سکتی تھی اور جو لوگ بڑے سے بڑے حکمران کو راستہ دینے کے لیے تیار نہیں تھے ان ہی کے دل میں یہ احساس پیدا کر دیا کہ وہ امام کو راستہ دیں۔

(چنانچہ عالمِ عرب کے ایک نہایت ممتاز شاعر فرزدق نے بہت تفصیل سے اس واقعہ کو اپنے قصیدہ میں بیان بھی کیا ہے[1])

یہ نہ کہیے کہ لوگ بادشاہوں کے دین پر ہوتے ہیں، کیا آپ نہیں جانتے کہ اس وقت کے بادشاہ کا امام زین العابدین علیہ السلام کے ساتھ کیا سلوک تھا۔

[1] ملاحظہ ہو "دار الثقافۃ الاسلامیہ کی کتاب "صدائے حضرت سجادؑ" صفحہ ۱۹۱ تا ۲۰۵۔

ہشام ابن عبدالملک یا خود عبدالملک، ان میں سے کون تھا جو امامؑ کا عقیدت مند رہا ہو، ان میں سے کون تھا جس کے خیالات امامؑ کے بارے میں صحیح رہے ہوں ـــ؟ (تاکہ یہ سوچا جائے کہ لوگوں نے بادشاہ کی خاطر امامؑ کے لیے راستہ بنایا ـــــ؟)

حقیقت یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں امامؑ کی ایسی عظمت تھی کہ وہ خود بخود ان کی طرف کھنچتے تھے جس کا حقیقی سبب یہ ہے کہ امام کی اپنے اللہ کے ساتھ جو وابستگی تھی وہ حدِ کمال کو پہنچ چکی تھی۔

اور اللہ سے کامل وابستگی اگر ایک طرف انسان کے لیے شرف و کمال کی حیثیت رکھتی ہے تو دوسری طرف اس کے لیے میدانِ عمل میں کامیابیوں کا وسیلہ بھی ہے کیونکہ یہ وابستگی موجبِ ثبات واستقلال ہے جیسا کہ ہم اس موضوع پر "باعمل انسان کی اخلاقی کیفیت" کے تحت تفصیلی گفتگو کریں گے۔

کیونکہ باعمل انسان کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی زندگی اللہ سے روابط کے ساتھ ہم آہنگ ہوتی ہے اور یہ قربت و روابط انسان کے اندر امید کی ایسی کرن پیدا کر دیتے ہیں کہ وہ اپنی آرزوؤں کو خدا ہی سے طلب بھی کرتا ہے اور قبولیت کی توقع بھی اسی سے رکھتا ہے۔

لیکن اگر انسان اپنی آسائش کے زمانے میں اللہ کو فراموش کر دے، اس کے دین کی طرف توجہ نہ دے اور مذہب کو پیش آنے والے مسائل کو حل کرنے کی جد و جہد نہ کرے اور خدا کے بجائے اپنی فکر ہی میں غلطاں رہے، تو ایسا شخص ابتلاء و آزمائش کے موقع پر عرشِ الٰہی کی طرف دستِ دعا کیسے بلند کر سکتا ہے اور قبولیتِ دعا کی کیسے امید رکھ سکتا ہے؟

خداوندِ عالم اس کی دعا کیسے قبول کرے گا اور اس کی آواز کیسے سُنے گا۔

جس نے اپنی زبان کو ذکرِ الٰہی سے آشنا کیا ہی نہ ہو، جس کے اعضاء و جوارح نے خوشنودیٔ خدا کے لیے کوئی کام ہی نہ کیا ہو اور جس دل میں محبتِ الٰہی کا شوق ہی نہ پیدا ہوا ہو وہ خدا سے کیا امید رکھ سکتا ہے اور اس کے لیے قبولیتِ دعا کے کیا امکانات ہیں؟

ہمارے لیے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ہم قبولیتِ دعا کی امید رکھیں۔ البتہ اگر ہم نے اللہ سے اپنی وابستگی کو کامل رکھا ہوتا اور اپنی شخصیت و زندگی کو اس کی مشیت کے مطابق ڈھالا ہوتا تب یہ ممکن تھا کہ ہم اپنی تمام مشکلات اور ابتلاؤں میں اس سے یہ فرمائش کرتے کہ وہ ہماری مدد و نصرت کرے اور دشمن کے مقابلے میں ہمیں فوقیت عطا کرے۔

داستانِ جناب یوسف ابنِ تاشفین

اسپین کے مسلمانوں کو پانچویں صدی ہجری میں جب وہاں کے عیسائیوں کی طرف سے یلغار کا سامنا ہوا تو انھوں نے مراکش کے حکمران یوسف ابنِ تاشفین سے مدد طلب کی چنانچہ وہ ایک لشکرِ جرار لے کر نکلا۔ سمندری راستے کو طے کیا تاکہ اسپین کے مسلمانوں کو صلیبی یلغار سے بچائے۔

کیونکہ اس یلغار کی بناپر اس کی حکومت وسلطنت مکمل طور پر خطرے میں پڑ گئی تھی۔ چنانچہ یوسف بن تاشفین جب اپنے تمام ساز و سامان کے ساتھ جہاز میں بیٹھ کر سمندر میں اترا تو ایک انتہائی تیز و تند آندھی نے اسے اس طریقے سے ڈبویا کہ جہاز کا وجود خطرے میں پڑ گیا۔ چنانچہ یوسف ابن تاشفین اپنے لشکر والوں کے درمیان میں کھڑا ہو گیا اور اس طرح دعا کرنی شروع کی:

"اے پالنے والے تو جانتا ہے کہ میں نے جو
اپنے شہر کو چھوڑا،
اپنی سرزمین سے جُدا ہوا،
اس سمندر میں اُترا ــــــ،
ایک براعظم سے دوسرے براعظم تک سفر کیا،
اپنے آپ کو ــــــــــ
موت کے منہ میں ڈالا،
اپنے گھر والوں،
بال بچوں ــــــ،
لشکر اور مملکت کے وجود کو بھی ــــــــــــــ
خطرے میں ڈالا ــــــ!
تو صرف اس لیے کہ تیرے دین کی حمایت کروں
اور
اسپین کی سرزمین پر تیرے پیغام کی خدمت کروں۔
یورپ کی سرزمین پر ــــــــــ
جو مسلمان
زندگی گزار رہے ہیں ان کی حفاظت کر کے اسلامی وجود کو
باقی رکھوں۔
یہ سب کچھ میں نے ــــــــــ
تیری خاطر کیا ہے۔
اے پالنے والے! ــــــــــ

تیرے علم کے مطابق ،

اگر میری نیت سچی ہے ،

اور

اس طوفان سے نجات پاکر عافیت کے ساتھ ——

ساحل تک پہنچنے میں ،

اسلام اور مسلمانوں کی بہتری ہے ،

تو

اس طوفان کو ختم کر اور ہمیں اس سے بچا ۔"

(قبل اس کے کہ ہم تاریخ کے حوالے سے اس داستان کو سپرد قلم کریں کہ یوسف بن تاشفین کی دعا کا کیا نتیجہ نکلا ، قارئین کرام کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں کہ :)

یوسف ابن تاشفین امام یا الٰہی نمائندہ نہیں تھا اور ہم نے اس کی مثال بھی اسی لیے پیش کی ہے کہ وہ بھی ایک عام آدمی تھا اور ہمارے شرعی معیار کے اعتبار سے کسی خاص فضیلت کا مالک نہیں تھا ۔ نہ امام تھا ، نہ معصوم تھا ، بلکہ مسلمانوں ہی میں سے ایک شخص تھا جس نے اپنی تمام طاقتیں اللہ کی راہ میں لگا دیں ۔ اپنے گھر سے خدا کے دین کی خاطر نکلا ، خدا کے دین کی خاطر ہجرت کی اور اسے اللہ سے بھرپور ارتباط کا مکمل شعور بھی حاصل تھا اور اسی احساس و شعور نے اس میں یہ قوت پیدا کی کہ وہ اپنے پروردگار سے اتنے مستحکم انداز سے اپنی حاجت طلب کرے اور اپنی دعاؤں کی قبولیت کی امید رکھے

جیسے ہی یوسف ابن تاشفین کی دعا ختم ہوئی ۔ سمندر کی پرشور لہریں ساکن

ہو گئیں طوفان ٹھہر گیا اور تمام حالات سفر کے لیے سازگار ہو گئے یہاں تک کہ یوسف ابنِ تاشفین سلامتی کے ساتھ منزلِ مقصود تک پہنچ گیا۔ جہاں اس نے سرکش عیسائیوں کو زیر کیا اور اسلام کی عظمت کا پرچم اس طرح بلند کیا کہ اس کی اس خدمت کی بنا پر اسپین کے اندر مزید چار سو برس تک مسلمانوں نے زندگی گزاری۔

یوسف ابن تاشفین کی فتح کے چار سو برس تک اسپین میں مسلمانوں نے پرسکون زندگی گزاری۔ وہ اللہ کو ایک اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ کا رسولؐ اسی طرح مانتے تھے جس طرح یوسف ابن تاشفین کے زمانے کے لوگ مانتے تھے۔ لیکن اب یہ لوگ اللہ کو بھول چکے تھے۔ اس سے رشتہ توڑ چکے تھے لہو ولعب اور فسق وفجور میں پڑے ہوئے تھے اور ان کی زندگی سر تا پا گناہوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔

جب ان کی زندگی اللہ کی خوشنودی کے راستے سے بالکل الگ ہو گئی تو ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اس سرزمین پہ زندگی گزارنے والے مسلمان دینی و دنیاوی اعتبار سے اتنے پست ہو چکے تھے کہ غرناطہ میں مسلمانوں کا جو حکمران تھا وہ صلیبی حکمرانوں کے سامنے سر جھکانے پہ مجبور ہو گیا۔ غرناطہ مسلمانوں کا وہ آخری شہر تھا جو اسپین کی سرزمین پر بچا ہوا باقی رہ گیا تھا۔ لیکن خدا فراموشی کی بنا پر وہاں کا حکمران اس قدر پستی کا شکار ہوا کہ اس نے اسلام اور مسلمانوں کے جنازے میں آخری کیل ٹھونک دی اور اسپین سے اسلام کے خاتمے پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔

روایت میں ہے کہ جس وقت وہ بے بس بادشاہ اپنے وجود، اپنے دین و مذہب، اپنے عقیدے اور اپنی قوم کے خاتمے کی دستاویز پر دستخط کر رہا تھا۔

اس کی زبان پر یہ جملے تھے :

" اَشْہَدُ اَنْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْہَدُ اَنَّ مُحَمَّدً رَّسُوْلُ اللّٰہِ "

اس وقت اس کے اردگرد جو حکام کھڑے تھے انھوں نے بھی اس جملے کو دہرایا اور پھر ان لوگوں نے اپنی زبان پر یہ الفاظ دہرائے کہ :

" خدا کے فیصلوں کو کوئی ٹال نہیں سکتا اور اس کے حکم کو کوئی روک نہیں سکتا "

یہ کہنے کے بعد اس دستاویز پر دستخط کر دیے جو آخر کار اسپین کی سرزمین سے اسلام کے خاتمے کا سبب بنی ۔

سوچیے ! کیا یہ لوگ مسلمان تھے ؟

بظاہر تو مسلمان ہی تھے ، آخری لمحے تک کلمہ پڑھ کر اپنے اسلام کو دنیا والوں کے سامنے پیش کر رہے تھے اور اس کے باوجود اسلام کے خاتمے کی دستاویز پر دستخط بھی کر رہے تھے ۔ پھر ایسے کلمہ کا کیا فائدہ ؟

(جس میں توحید اعمال کے تقاضوں کو پورا نہ کیا جائے ۔ مسلمانوں کے عمومی مقاصد کو مدنظر نہ رکھا جائے ، اور اجتماعی وجود کی بقا کے لیے جدوجہد نہ کی جائے ۔

اسپین کی سرزمین جو ایک وقت مسلمانوں کا عظیم الشان گہوارہ تھی ۔۔ مسلمانوں کی اپنی ذاتی کوتاہیوں کی وجہ سے آج اُن کے وجود سے مکمل طور پر خالی ہو چکی ہے ۔

اسپین کا بادشاہ جس کا یہ فرض تھا کہ اسلام کی بقا اور مسلمانوں کی حفاظت کے لیے اپنی تمام توانائیوں کو صرف کرتا ۔ اس نے ایک

ایسی دستاویز پر دستخط کر دیے جس کے بعد مسلمانوں کی تمام دینی و
مذہبی سرگرمیاں نہ صرف موقوف ہوئیں بلکہ کالعدم بھی قرار پاگئیں۔
سوچیے! اس المناک سانحہ کی اصل اور بنیادی وجہ یہ تھی کہ:
اس سے قبل یہ اور اس کے زیر سلطنت حکمرانی کرنے والے تمام امراء و حکام
باہمی تنازعات و اختلافات کا اس طرح شکار تھے کہ خدا کے احکام و فرامین سے
کوسوں دُور ہو چکے تھے اور چونکہ انھوں نے خدا کی نافرمانی کو اپنا معمول بنا رکھا تھا
اس لیے آخری لمحات میں مسلمانوں کو بچانے کا جو خیال پیدا ہوا وہ سود مند ثابت
نہ ہو سکا۔

لہٰذا انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہر لمحہ اللہ سے وابستگی کو مستحکم رکھے
اور اپنے کو اس لائق بنائے کہ خدا سے قبولیتِ دعا، مدد و نصرت، پشت پناہی
اور فتح و ظفر کی درخواست کر سکے اور اس کی دعا اس قابل ہو کہ قبولیت کی اُمید و
آرزو کی جا سکے۔

۲۔ بے عمل انسان کی کیفیت

دوسرا پہلو یہ ہے کہ ہماری کیفیت اور اخلاقی حالت ایک باعمل
انسان جیسی نہیں رہی۔ کیونکہ ایسے بنیادی مشاہدے موجود ہیں جو یہ واضح
کرتے ہیں کہ ہم جس کیفیت میں زندگی گزار رہے تھے وہ کسی ایسے باعمل
انسان کی زندگی نہیں ہو سکتی جو اللہ کے پیغام کو نمونۂ زندگی بنانے اور انبیاء
کی سیرت کو دنیا میں پھیلانے کا ذمہ دار ہو۔

ہمیں اپنے نفس کا محاسبہ کرنا چاہیے، اپنی کیفیتِ عمل کو بہتر بنانا

چاہیئے، اپنی موجودہ حالت کو بدلنا چاہیے اور رفتہ رفتہ ایک باعمل انسان کے قالب میں خود کو ڈھالنا چاہیے تاکہ ہم صحیح عمل کی بنیادوں کو استوار کرنے کے لیے زمین ہموار کر سکیں۔

جذبہ ایثار وقربانی

وہ کیفیت جس کے مطابق ہم زندگی گزار رہے تھے اس کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ ہم ایثار اور قربانی کے احساسات سے ہٹ کر شخصی مفادات ہی سے پیوستہ ہو کر رہ گئے ہیں۔ (اور اسی وجہ سے مشکلات کا شکار ہیں) اس لیے ہمیں سخت ضرورت ہے کہ شخصی مفادات سے توجہ ہٹا کر اپنے اندر جذبۂ ایثار کو پروان چڑھائیں اور افراد کی مصلحتوں کے بجائے پوری قوم کے مفاد کو پیش نظر رکھیں۔ یاد رکھیے ہمیں قومی مفادات کے تحفظ کے لیے شخصی مصلحتوں کی قربانی بہر حال دینی پڑے گی۔

ہم اب تک قومی مفادات کو ذاتی مصلحتوں پر قربان کرتے رہے ہیں اور ہمارا مرکز توجہ ذاتی فوائد رہے ہیں اور جب بھی قومی مفادات ذاتی مصلحتوں سے ٹکرائے ہم نے ذاتی مصلحتوں کو ہی ترجیح دی۔

اور ہماری یہ اخلاقی پستی جس کی بنا پر ہم اپنے انفرادی مفادات ہی میں الجھ کر رہ گئے، اس نے بیشتر صلاحیتوں اور امکانات کو متاثر کیا۔ خاص طور پہ جس قسم کے ماحول میں ہم اس مرکز میں زندگی گزار رہے تھے (ایک پراگندہ ماحول جس میں ہر طرف نفسا نفسی کا عالم ہو) ایسے ماحول میں جو لوگ بھی زندگی گزاریں گے ان کی نظر شخصی مفادات ہی پر رہے گی۔ قومی مفادات اور عمومی مصالح کے لیے قربانی کا جذبہ ان میں باقی ہی نہیں رہے گا۔ کیونکہ یہ لوگ اپنی صلاحیتوں اور

امکانات ذاتی انفرادی فوائد کے حصول اور اسی کے دفاع کے لیے صرف کرتے رہیں گے۔

اور جب قومی مفادات کو ذاتی مصلحتوں پر قربان کرنے کی عادت پڑ جائے تو جو شخص بھی ایسے ماحول میں زندگی گزارے گا اسے بس اپنی ہی فکر ہوگی اور جو بھی کوشش کرے گا وہ اپنے ہی تحفظ کے لیے ہوگی۔

یہی وجہ ہے کہ ہماری اسی فیصد (۸۰٪) صلاحیتیں اندرونی مسائل میں ضائع ہو جاتی ہیں۔ جبکہ یہ صلاحیتیں جو اندرونی انتشار کی بنا پر ضائع ہوئیں (انھیں اعلیٰ مقاصد کے لیے بخوبی استعمال کیا جا سکتا تھا اور) اگر ہمارے اندر ایک باعمل انسان کی خصوصیات زندہ ہوتیں تو ان صلاحیتوں کو قومی تعمیر میں خرچ کرتے اور یہ کوشش کرتے کہ خدا کی راہ میں ایثار و قربانی کا جذبہ پیدا کر کے شخصی مصلحتوں کو قومی مفادات پر قربان کرنے کی عادت پیدا کریں، اس جذبہ کو پروان چڑھائیں لوگوں کے دلوں میں اس کو راسخ کریں اور وسیع پیمانے پر اسے پھیلائیں۔

اگر ہم قومی شعور کی دولت سے مالا مال ہوتے تو دنیاوی اعداد و شمار کے لحاظ سے بھی ہم اپنی صلاحیتوں سے زیادہ فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ بجائے اس کے کہ ہم اندرونی انتشار کا شکار ہو کر اپنے قومی وجود کو خطرہ میں ڈالتے رہیں اور رفتہ رفتہ تباہی کی طرف قدم بڑھاتے رہیں۔

ہم کب تک آپس ہی میں دست و گریباں رہیں گے جو روز بروز ہماری بربادی کو یقینی بناتا رہے اور لحہ بہ لحہ ہمیں فنا کے نزدیک پہنچاتا رہے۔ کیا ہم کبھی اپنے داخلی انتشار پر غور نہیں کریں گے اور کیا کبھی ایسا نہ ہوگا کہ ہم اپنے چھوٹے چھوٹے فوائد کو قوم کے بڑے مفادات کے لیے بھول جائیں۔

یاد رکھیے! باعمل انسان کی زندگی کی بنیادی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اسے اپنی ذاتی مصلحتوں کو قوم کے بڑے مفادات کے لیے قربان کرنے کا احساس

بھی ہوتا ہے اور سیاستہ بھی۔ لہٰذا ہمارے لیے بھی یہ بات انتہائی ناگزیر ہے کہ ہم اپنے نفس کی تربیت اسی انداز پر کریں۔

اسلوبِ عمل میں تبدیلی کی جستجو

باعمل انسان کی خصوصیات میں سے دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے اسلوبِ عمل میں تبدیلی پر آمادہ رہتا ہے (تاکہ حسبِ ضرورت اپنے طریقۂ کار میں تبدیلی پیدا کر کے بہتر نتائج حاصل کرسکے۔)

ہمارے نزدیک ایک تو ہمارے عقائد اور نظریات ہیں اور دوسری چیز ہمارا فعل ہے۔ عقائد و نظریات کی منزل میں (اگر پرکھا جائے) تو اس میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ اسلام ہمارا وہ دین ہے جو مستحکم بنیادوں پر قائم ہے۔ اس میں کسی بھی تغیر اور تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور قیامت تک کوئی دن ایسا فرض نہیں کیا جاسکتا جب اس دین میں کسی تغیر یا تبدیلی کی کوئی حاجت پیش آئے۔ کیونکہ یہ دین آسمانی شریعتوں میں سب سے اشرف اور ادیان و مذاہب میں سب سے آخری دین ہے۔ جسے خداوند عالم نے ہر زمانے اور ہر جگہ کے لوگوں کے لیے (قیامت تک کے لیے) پسند کیا ہے۔

اس لیے عقائد و نظریات کے اعتبار سے ہم ایسی مستحکم منزل پر ہیں جس میں کسی قسم کی تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ بات انتہائی غلط ہوگی اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اسلام وقت کے قالب میں اپنے کو ڈھال لیتا ہے کیونکہ دینِ اسلام زمان و مکان سے بلند ہے۔ اسے اس ذات نے بھیجا ہے جو خالقِ زمان و مکان ہے اور اس نے اس میں یہ صلاحیت رکھی ہے کہ جب تک زمانہ برقرار

رہے گا یہ دین باقی رہے گا۔

اسلام کے نظریات اس قدر مستحکم ہیں کہ ان میں تغیر کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ زمانے کے تغیرات سے بالاتر ہے' نہ یہ کہ زمانے کے تغیرات کو اس سے بالاتر سمجھا جائے اور اسلام کے بارے میں ہمارا یہ وہ نظریہ ہے جو تمام اذہان میں بالکل واضح رہنا چاہیے۔

البتہ اسلام کے نظریات پر عمل کے سلسلے میں اسلوب اور طریقۂ کار میں تبدیلی ہو سکتی ہے۔ میں اسے استصحابی طریق کار کے نام سے یاد کرتا ہوں — وہ (استصحاب) جس کے بارے میں علمِ اصول فقہ میں ہم نے جو کچھ پڑھا اسی کو اپنی زندگی پر ڈھالا اور چونکہ استصحاب میں بنیادی طور سے زمانہ ماضی ہی کی طرف دیکھا جاتا ہے اس لیے ہم اسی کے عادی ہو گئے اور ہم نے اس سے بہتر طریقہ کار کے امکان پر غور کرنا بھی چھوڑ دیا۔ یہ استصحابی طریق کار جیسا بھی تھا۔ اس کی مبالغہ آمیز پاسداری نے ہمیں اس قابل نہیں رکھا کہ ہم اپنی ذمہ داریوں سے صحیح طور پر عہدہ برآ ہو سکیں کیونکہ اسلوب عمل دنیا سے ارتباط چاہتا ہے۔ بالفاظ دیگر عمل سے ہم آہنگی کا طلب گار ہے۔ اور اس کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم جس چمن کو آباد کرنا چاہتے ہیں اس سے پوری طرح وابستہ بھی رہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ جس چمن کو ہم آباد کرنا چاہتے ہیں وہ یہی قوم ہے جس کے اندر ہم نیکی، تقویٰ، پرہیزگاری، ایمان اور عمل صالح کی بنیادوں کو استوار کرنا چاہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ قوم ایک حالت پر باقی نہیں رہتی بلکہ اس کے حالات بدلتے رہتے ہیں یہ صحیح ہے کہ دین میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ قوم کے حالات بدلتے رہتے ہیں۔ نسلِ نو اپنے خیالات' اخلاق، معاشرتی تعلقات، اقتصادی حالات، ماحول غرض ہر چیز میں سابق نسل سے یکسر مختلف ہے۔ تو جب یہ قوم ان تمام امور میں گزشتہ اقوام سے مختلف ہے

تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ہمارا طریقۂ کار اس قوم کے ساتھ بھی وہی ہو جو سابقہ اقوام کے ساتھ تھا۔

(مثال کے طور پر) آج اگر آپ اپنی ہی قوم کے کسی ایسے شخص سے ملنا چاہیں جو دوسرے شہر میں رہتا ہو تو آپ (گزشتہ زمانے کی طرح) نہ پیدل چلیں گے اور نہ کسی جانور کی سواری کو اپنائیں گے بلکہ اس تک پہنچنے کے لیے کسی کار یا گاڑی کو استعمال کریں گے۔

ایسا کیوں ہوا؟ ظاہر ہے کہ ایسا اس لیے ہوا کہ قومی حالات بدل چکے ہیں اور ہمیں قوم کے اندر رہتے ہوئے ہی اپنے عمل کو انجام دینا ہے اور اسی قوم کے دلوں میں تقویٰ، پرہیزگاری، ایمان اور عمل صالح کی آبیاری کرنا ہے، اس لیے قوم کے حالات تصورات، افکار و نظریات اور ماحول کو بھی پیش نظر رکھنا پڑے گا۔ کیونکہ یہی تصورات افکار و نظریات جو قوم کے اندر پائے جاتے ہیں ہمارے لیے طریقۂ کار کو معین کرتے ہیں چنانچہ یہ ممکن نہیں ہے کہ ہمارا جو طریقۂ کار سابقہ اقوام کے ساتھ تھا وہی موجودہ نسل کے ساتھ بھی ہو اور وہی آنے والی نسلوں کے ساتھ بھی؟!

ہمیں "استصحابی طریقۂ کار" سے لازمی طور پر اپنا دامن چھڑانا چاہیے۔ تاکہ طریقۂ کار کے سلسلے میں ہم لکیر کے فقیر ہو کر نہ رہ جائیں کیونکہ یہ اسلوب ہمارے کچھ بزرگان کے نزدیک اس قدر اٹل ہے کہ اگر کوئی شخص کسی نصابی کتاب میں کوئی تبدیلی پیدا کرنا چاہے اور ایک نئی کتاب جو بہتر اسلوب بیان سے لکھی گئی ہو پیش کرے تو اس کے مقابلے پر بھی یہی استصحابی کیفیت سد راہ بنتی ہے۔

یہ ایک انتہائی ادنیٰ مثال تھی ہمارے جمودِ فکر کی کہ نصاب میں معمولی تبدیلی بھی گوارہ نہیں اور ہم اس بات پر مُصر رہتے ہیں کہ صرف وہی کتابیں پڑھائی جائیں جو سینکڑوں برس پہلے جناب شیخ انصاری یا جناب محقق قمیؒ کے زمانے میں پڑھائی جاتی تھیں۔ یہ استصحابی طریقۂ کار وہ ہے جس نے ہمیں ماضی کی اس قوم کے درمیان

پہنچا دیا ہے جو دنیا سے گزر چکی اور جس کے حالات تبدیل ہو چکے۔ جب کہ ہم ایک نئی قوم کے درمیان زندگی گزار رہے ہیں جس کے افکار، خیالات اور ماحول سب باتیں مختلف ہیں لہٰذا یہ فطری بات ہے کہ ہمارے عمل میں کوتاہیاں رہ جائیں کیونکہ ہم نے عملی میدان میں موجودہ نسل سے واسطہ ہی نہیں رکھا جس کے نتیجہ میں منفی رجحان پروان چڑھتا رہا۔ ہماری ساری کارکردگی ان لوگوں کے مطابق تھی جو دنیا سے گزر چکے لیکن جو لوگ اس وقت موجود ہیں ان سے ہمارا عملی طور پر کوئی ربط برقرار نہیں رہا۔ اب بھی ہمیں سنبھل جانا چاہیے۔ اگر ہم اپنے مرکز کی بقا چاہتے ہیں اور ہم اس بات کے آرزومند ہیں کہ موجودہ پریشانیاں ختم ہوں اور ہمارے حالات بدلیں تو ہمیں یہ بات واضح طور پر معلوم رہنی چاہیئے کہ جس شخص سے ہمارا واسطہ ہے وہ بھی زندہ اور موجود ہے اور ہماری طرح گوشت پوست سے بنا ہوا ہے۔ وہ بدل بھی سکتا ہے، ترقی بھی کرسکتا ہے اور تنزلی بھی۔ اس کا ماحول بگڑ بھی سکتا ہے۔ اس کے حالات خراب بھی ہو سکتے ہیں، اور ہمیں جب اس کے ساتھ بہرحال زندگی گزارنی ہے تو ہمیں ہر آن اس روش کو بھی پیش نظر رکھنا پڑے گا جس کو اپنا کر ہم اس کے ساتھ ہم آہنگی کو برقرار رکھ سکیں۔

جیسا کہ میں نے اپنی پہلی تقریر میں عرض کیا تھا جناب شہید اوّل علیہ الرحمۃ نے سیکڑوں برس قبل اس بات پر غور کیا کہ دینی حالات اور مراجع کی صورتِ حال میں کس طرح نظم وضبط پیدا کیا جائے اور مرکز دینی کے وجود کو کس طرح تدریجاً ترقی دی جائے لیکن کیا شہید اوّل کے بعد پیدا ہونے والے وہ سینکڑوں علماء جو گزر چکے یا جو موجود ہیں یا جو ہزاروں افراد بعد میں پیدا ہوں گے کیا یہ بات ناممکن ہے کہ تمام حضرات جناب شہید اوّل کے لائحہ عمل کو آگے بڑھانے، ترقی دینے،

نکھارنے اور سنوار کر پیش کرنے کی فکر کریں۔

سوچیے ! کیا یہ بات ناممکن تھی (نہیں ، ہرگز ناممکن نہ تھی) جناب شہید اوّل نے اس دینی مرکز کے لیے کچھ قوانین وضع کیے تھے لیکن کیا یہ قوانین آج بھی اسی طرح برقرار ہیں اور پھر یہ بھی سوچیے کہ ان قوانین کو اسی حالت پر باقی رہنا چاہیے جو حالت بادشاہوں کے زمانے میں تھی اور جس زمانے میں شام کی سرزمین پر ملوکیت کا قبضہ تھا اس زمانے میں اس مرکز کے لیے جو حدود قائم کی گئی تھیں کیا آج بھی انھیں حدود کو باقی رکھنا چاہیے جبکہ ساری دنیا بدل چکی ہے اور ملوکیت کا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔

جب ہمیں یقین ہے کہ نظریات کے ثابت رہنے کے باوجود پوری زندگی کا اسلوب بدل چکا ہے تو پھر ہمیں اس نئے اسلوب کے بارے میں غور و فکر کا دروازہ بھی کھولنا چاہیے اور جس طرح سے کہ ہم فقہ اور اصول کے نظریات پر غور کرتے ہیں اور جس طرح سے ہم اصول فقہ میں ترتب اور امر و نہی کے اجتماع پر بحث کرتے ہیں یا جس طرح فقہ میں اس بات پر بحث کی جاسکتی ہے کہ انگور کا شیرہ پاک ہے یا ناپاک ، حرام ہے یا حلال ، اسی طریقے سے ہمیں اسلوبِ عمل کے پہلو پر بھی غور کرنا چاہیے۔

یاد رکھیے ! کہ یہ بھی ہماری ذمہ داری ہے کیونکہ ہم علم اسی لیے تو حاصل کرتے ہیں کہ عمل کریں ، اس لیے تو نہیں کہ اسے اپنے خزانۂ ذہن میں محفوظ اور منجمد کر دیں اور جب علماء کو انبیاء کا وارث قرار دیا گیا ہے تو یہ بھی تو غور کرنا چاہیے کہ انبیائے کرام عملی میدان میں کتنا زیادہ حصہ لیتے تھے۔ وہ عالم یقیناً تھے اور دنیا بھر سے زیادہ علم رکھتے تھے لیکن عملی زندگی میں بھی بھرپور حصہ لیتے تھے۔ ان میں کوئی بھی نعوذ باللہ بے عمل انسان نہیں تھا۔ اور جب ہم انبیاء کے وارث ہیں تو ہمیں بھی یہ یقین رکھنا چاہیے کہ عمل ہماری ذمہ داری ہے نہ کہ صرف علم حاصل کرنا ہماری ذمہ داری ہے اور جب عمل ہماری ذمہ داری ہے تو پھر ہمیں اپنے معمولات

کا جائزہ لینا چاہیے۔ اپنے ضمیر و وجدان سے پوچھنا چاہیے۔ اپنے معاصرین کے درمیان یہ مسئلہ اٹھانا چاہیے اور اپنے اساتذہ سے اس سلسلے میں رہنمائی حاصل کرنی چاہیے کہ وہ عمل کیا ہے ـــــــ اور اس کے بعد کس طرح ہم با عمل بن سکتے ہیں ـــــــ اسلوبِ عمل کیا ہے ـــــــ اور کس طرح یہ ممکن ہے کہ ہم اپنے طریقۂ کار میں ایسی تبدیلی پیدا کریں جو آج کے حالات سے ہم آہنگ بھی ہو سکے اور (شریعت کے تقاضوں کی مکمل پاسداری کرتے ہوئے) ہم کس طرح آج کی موجودہ دنیا میں زندگی گزاریں۔ آج کی وہ دنیا جو ملوکیت کی دنیا نہیں ہے۔

(تو پھر وہ قوانین جو ملوکیت کے زمانے میں بنائے گئے تھے آج کی دنیا میں کیونکر قابل عمل ہو سکتے ہیں؟)

ہو سکتا ہے کہ ان سوالات کا جواب ابتدائی طور پر بہت مشکل ثابت ہو۔ کیونکہ ان کے بارے میں نہ عمومی مطالعہ رہنمائی کرتا ہے اور نہ فکری تربیت ہوتی ہے جبکہ علمِ اصول کے مسائل کا جواب آسان ہوتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عالم جس سے آپ یہ مسئلہ دریافت کر رہے ہیں (ممکن ہے اس نے بیس[20] برس تک علمِ اصول پڑھا ہو اس لیے فقہ و اصول کے مسائل کا وہ نہایت آسانی سے جواب دے گا) لیکن چونکہ یہ سوالات ذاتی طور پر بھی پیچیدہ ہیں اور ان کا تعلق انسان کے ذاتی تجربات اور عمومی حالات سے واقفیت سے ہے اس لیے ان کا جواب مشکل نظر آتا ہے۔

لیکن بہر حال ہمیں اس دشواری پر قابو پانا چاہیے اور مسلسل بحث و مباحثہ اور غور و فکر کے ذریعے اس مہم کو سر کرنا چاہیے جس کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اسے بھی اپنے فرائض کا ایک حصہ قرار دیں اور مسلسل غور کریں کہ کس طرح اسلوبِ عمل کو بدل سکتے ہیں اور کس طرح اپنے حالات اور اپنے معاشرے کے ساتھ ہم آہنگی پیدا

کر سکتے ہیں۔

کیا وجہ ہے کہ یہ علمی مرکز جو سینکڑوں برس سے اس شہر میں موجود ہے آج ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ اپنے ہی شہر میں اجنبی بن چکا ہو اور اس شہر کے رہنے والے اس کی طرف عداوت، حسد، رقابت اور بغض و کینہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

(یقیناً ان لوگوں کا یہ عمل ایک انتہائی سنگین جرم ہے، لیکن اہلِ علم کو غور کرنا چاہیے کہ) اگر یہ لوگ آج یا اب جرم کے مرتکب ہو رہے ہیں تو ہم ان سے پہلے جرم کا ارتکاب کر چکے ہیں (کہ ان لوگوں کی صحیح تربیت نہیں کی) لہٰذا آج جو حالات در پیش ہیں اس کی ذمہ داری ان لوگوں سے پہلے خود ہم لوگوں پر عائد ہوتی ہے کیونکہ ہم نے ان لوگوں کے ساتھ کوئی ربط نہیں رکھا، ان لوگوں کے آباؤ اجداد کے ساتھ تو ہمارا ربط ضرور برقرار تھا لیکن خود ان لوگوں کے ساتھ ہمارا ربط کمزور ہو چکا ہے اور پھر یہی نسل نو ہے جو آج ہم پر ناراض ہے اور ہمارے خلاف مظاہرے کر رہی ہے کیونکہ اس کا یہ خیال ہے کہ ان کے وہ آباؤ اجداد جو دنیا سے گزر چکے ان سے تو ہم نے ربط برقرار رکھا، مگر جو موجود ہیں ان سے ہمارا کوئی ربط ہی نہیں ہے اور چونکہ ہم نے ان کے لیے (ان کی تبلیغ و تربیت کی غرض سے) کچھ پیش نہیں کیا اور نہ ان سے ربط رکھا۔ اس لیے وہ ہم سے ناراض ہیں اور جو کچھ کر رہے ہیں وہ ان کی ناراضگی کا ردِ عمل ہے۔

میں ایک سال سے بلکہ اس سے زیادہ مدت سے اپنے تمام برادران اور عزیزوں سے یہ کہہ رہا ہوں کہ تمام اہلِ علم میں سے جس شخص میں جتنی صلاحیت موجود ہو اگر وہ اس شہر کے اندر تبلیغی سلسلہ شروع کرے اور کم از کم پانچ آدمیوں کی دینی تربیت شروع کرے، جس کا طریقہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اپنے قرب و جوار کے لوگوں کو مثلاً وہ دکان دار جس سے دہی خریدتے ہیں، وہ کریانہ مرچنٹ جس سے شکر خریدتے ہیں۔

وہ پڑوسی جس سے صبح شام سلام دعا ہوتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ غرض اسی قسم کے پانچ آدمیوں کو جمع کریں تو اگر تمام علمار جمعہ کے دن کوفہ جاکر صبح سے شام تک نہر میں نہانے یا بیت بازی میں وقت صرف کرنے یا دوسرے فضول کاموں میں اپنا وقت صرف کرنے کی بجائے اپنے گھر پر یا کہیں ایک دینی نشست رکھ لیں اور اپنے وقت کو ضائع کرنے کے بجائے اس نیک مقصد میں خرچ کریں (تو بہت بڑا نتیجہ حاصل کر سکتے ہیں)

غور کیجیے کہ اگر نجف کے ہزاروں عالموں میں سے صرف ایک ہزار حضرات پانچ پانچ آدمیوں کی دینی تربیت کرتے تو ہمارے پاس پانچ ہزار انتہائی تربیت یافتہ مومن ہوتے اور پھر اہل شہر کو بھی احساس ہوتا کہ ہمیں ان کی فکر ہے، ہم ان کے لیے کچھ کرتے ہیں، انھیں تعلیم و تربیت سے مالامال کرتے ہیں، زندگی کے مسائل میں ان سے مربوط رہتے ہیں اور ہماری علمی زندگی سے ان کی بھی فلاح و بہبود وابستہ ہے۔

لیکن چونکہ ہم نے یہاں کے لوگوں کے لیے کچھ نہیں کیا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ بھی ہمارے لیے کچھ نہ کریں (ہم اگر حالات کی اصلاح چاہتے ہیں تو) اس کے لیے ہمیں اپنے طریقہ کار کو تبدیل کرنے پر پوری طرح اور اچھی طرح سوچنا ہوگا اور ہمیشہ اس پر غور و فکر کرتے رہنا ہوگا کہ قوم سے ہم آہنگی استوار کرنے کا سب سے بہتر راستہ کون سا ہے !!

حسابی عقل اور سماجی عقل

آخر میں ایک بات اور باقی رہ جاتی ہے جسے ہماری موجودہ بحث کا تتمہ قرار دیا جاسکتا ہے اور وقت کی کمی کو ملحوظ رکھتے ہوئے میں نہایت

ہی اختصار کے ساتھ اس پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ اس نکتہ کی وضاحت نہایت ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ:

جب ہم اسلوب عمل کے بارے میں غور کریں تو فقہ واصول کی رائج اصطلاحوں اور ترتب یا اجتماع امر ونہی کے مباحث کے انداز پر غور نہ کریں کیونکہ عقل ریاضی کا انداز کچھ اور ہے۔

یاد رکھیے، عقل کے دو انداز ہیں جن میں سے ایک کو عقل ریاضی اور دوسرے کو عقل اجتماعی کہہ سکتے ہیں کیونکہ انسان کا اندازِ فکر کبھی اعداد وشمار کے مطابق ہوتا ہے اور کبھی معاشرے اور سماج کی ضروریات کے لحاظ سے۔

عقلِ ریاضی غور وفکر کا وہ انداز ہے جس میں دنیا کی کسی حقیقت کو اس وقت تک تسلیم ہی نہیں کیا جاتا جب تک ہر نقطۂ ضعف کو ایسی مستحکم دلیل سے زائل نہ کر دیا گیا ہو جس میں شک وشبہ کی گنجائش ہی نہ ہو کیونکہ ریاضی کا واضح اصول یہ ہے کہ اگر نتیجہ اتنا واضح ہو کہ جیسے دو اور دو چار تو قبول کیا جائے گا لیکن اگر دلیل اور برہان واضح اور قطعی نہ ہو تو اس نتیجہ کو قبول نہ کیا جائے۔

علمِ ریاضی کا انداز فکر یہی ہے اور علمِ اصول میں بھی ہم اسی انداز فکر پر چلتے ہیں کیونکہ علم اصول کے اکثر قاعدے دلیل اور برہان ہی پر قائم ہیں۔

لیکن ظاہر ہے کہ یہ انداز فکر اجتماعی اور سماجی انداز فکر سے مختلف ہے۔ کیونکہ سماج سے متعلق تمام امور میں منطقی دلیل وبرہان طلب نہیں کی جا سکتی۔

ہم ایک بار پھر ایک سادہ سی مثال پیش کرتے ہیں کہ اگر ہم نصاب کی کتابوں میں کوئی تبدیلی کرنا چاہیں اور کوئی شخص اسے قبول کرنے سے انکار کر دے تو ہمارے پاس کوئی دلیل اور برہان ایسی نہیں ہے کہ جس سے ہم یہ ثابت کر سکیں کہ اگر یہ کتاب نہ پڑھائی گئی تو (کوئی آفت آجائے گی) یا نقیضین جمع ہو جائیں گے اور اگر یہ کتاب

پڑھادی گئی تو ہم اس آفت سے بچ جائیں گے۔ علم ریاضی کے دلیل و برہان سے اجتماعی مسائل حل نہیں ہوتے۔

اجتماعی مسائل اجتماعی شعور سے وابستہ ہیں اور یہ اجتماعی شعور فکر کی پختگی، تجربات، زمانے کے حالات اور عالمی مسائل سے واقفیت کے ذریعے پیدا ہوتا ہے۔

لہٰذا ضروری ہے کہ ہم اپنی آنکھیں کھول کر دنیا کو دیکھیں، عالمی مسائل اور تجربات سے واقفیت حاصل کریں۔

ہم جب طریقۂ کار کو تبدیل کرنے کے بارے میں سوچیں تو ہمارا طرز فکر وہ نہ ہونا چاہیے جو عام اصول کے مطالب میں ہوتا ہے کہ آنکھیں بند کرلیں ایک کمرے میں بیٹھ گئے اور یہ سوچنا شروع کیا کہ فلاں بات ممکن ہے یا محال ہے۔

یہ صحیح ہے کہ غور و فکر کے لیے سب سے بہتر طریقہ یہی ہے کہ ہم ایک گوشے میں بیٹھ جائیں اور دلیل و برہان کی تمام اساسی باتوں کو پیش نظر رکھ کر اس مسئلے کا حل تلاش کریں، کیونکہ نظریاتی مسائل میں حقیقت و واقعیت ملحوظ ہوتی ہے خارجی زندگی کے حالات ملحوظ نہیں ہوتے۔

لیکن اجتماعی عمل میں اجتماعی شعور کی ضرورت ہوتی ہے اور اجتماعی شعور اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتا جب تک لوگوں سے روابط مستحکم نہ ہوں انسان عالمی حالات سے بھی باخبر ہو، ماحول کو بھی پہچانتا ہو، دوسروں کے تجربات سے بھی فائدہ اٹھائے اور اپنے اور دوسروں کے حالات سے موازنہ بھی کرے۔

جب ہم ان تمام مراحل کو طے کریں گے تب ہی اجتماعی شعور بیدار ہوگا۔ اور طریقۂ کار کے سلسلہ میں ہمارا انداز فکر صحیح رخ اختیار کرے گا۔

لہٰذا اصل بات یہی ہے کہ ہمیں اپنا اسلوب بدلنا چاہیے جس کا مقصد یہ ہے کہ جب ہم عملی زندگی کے بارے میں غور کریں تو اس روش پر نہ چلیں جو ہم اصولِ فقہ کے مطالب اور تحقیقِ مسائل کے سلسلے میں اختیار کرتے ہیں بلکہ ہمیں اجتماعی شعور کو اپنانا چاہیے اور اس بات کی جستجو کرنی چاہیے کہ ہم اپنے اذہان میں کس طرح ایسی گہرائی پیدا کریں جس سے یہ شعور بیدار ہو جس کے لیے ہمارے پاس وافر اطلاعات بھی ہونی چاہئیں اور عمیق تجربات بھی۔

خداوندِ عالم ہم سب کو توفیق دے اور خداوندِ عالم ہم سب کی خطاؤں کو معاف کرے۔

والسّلام علیکم

تم امام خمینی کی ذات میں
اس طرح جذب ہو جاؤ جیسے وہ
اسلام میں جذب ہو چکے ہیں۔
آیت اللہ شہید السید باقر الصدر

آیت اللہ المجدد و القائد السید محمد باقر الصدر ۲۵ ذی القعدہ ۱۳۵۳ھ کو پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق ایک ایسے ممتاز دینی خانوادے سے تھا جو تقریباً ایک صدی سے علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے اور جس کے مختلف افراد نے عراق، ایران اور لبنان میں اسلام اور مسلمانوں کی مخلصانہ اور گرانبہا خدمات انجام دی ہیں۔ سید محمد صدر جنہوں نے برطانوی استعمار کے خلاف علم جہاد بلند کیا اور عراق کے بیسویں انقلاب میں حصہ لیا اسی خاندان کے ایک گرامی قدر فرزند تھے۔ قم کے سید صدرالدین صدر اور لبنان کے سید موسیٰ صدر بھی اپنی دینی اور سیاسی خدمات کی بنا پر لازوال شہرت کے مالک ہیں۔ آیت اللہ کے ایک اور بزرگ سید عبدالحسین شرف الدین بھی فرانس کے خلاف جبل عامل (لبنان) کی جنگ آزادی میں مجاہدانہ کردار ادا کرنے کے لیے مشہور ہیں۔

جب آیت اللہ محمد باقر الصدر کے والد بزرگوار کا انتقال ہوا تب آپ کی عمر صرف چار سال تھی۔ اس کے بعد آپ کی تعلیم و تربیت کی ذمے داری آپ کی والدہ ماجدہ اور آپ کے بڑے بھائی السید اسماعیل الصدر نے سنبھالی۔ آپ صغر سنی سے ہی غیر معمولی ذہانت اور عظیم صلاحیتوں کے مالک تھے دس سال کی عمر میں ہی آپ علمی مقالات اور اسلامی تواریخ پر یوں اظہار خیال فرماتے تھے جیسے کہ آپ نے بیسیوں سال تک اس بحر ذخار میں شناوری کی ہو۔ گیارہ سال کی عمر میں آپ نے منطق پر ایک کتاب لکھی اور اسی زمانے میں اس موضوع پر درس و تدریس کا آغاز بھی کر دیا۔

۱۳۶۵ھ میں آپ نے نجف الاشرف میں مستقل طور پر قیام فرمایا اور اسلامی فقہ کے اصول اور دوسرے اسلامی علوم پڑھنے اور پڑھانے کا سلسلہ شروع کیا۔ آپ کی ذہانت کا یہ عالم تھا کہ جو سباق آپ خود پڑھتے تھے انھیں کسی استاد کی مدد کے بغیر خود مکمل طور پر سمجھنے پر قادر تھے۔ بالآخر آپ مجتہد کے رتبہ جلیلہ پر فائز ہوئے اور پھر خود اجتہاد پر درس دینے اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے۔ آپ نے علم اصول اور علم فقہ پر منفرد انداز میں قلم اٹھایا اور ان علوم پر بہترین کتابیں لکھیں۔ علاوہ ازیں علم الاقتصاد، علم فلسفہ، مشکلات اجتماعی اور نظام حکومت پر بھی آپ نے شاہکار کتابیں تصنیف کیں۔ آپ کی تحریر کردہ کتابوں کی کل تعداد ۲۶ ہے جن میں سے کئی ایک کا فارسی، انگریزی، اردو اور ترکی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

آیت اللہ السید محمد باقر الصدر کو مراکش سے انڈونیشیا تک سارے عالم اسلام میں بے پناہ عزت اور شہرت حاصل تھی اور آپ اسلامی طرز حکومت کے بہت بڑے مؤید تھے۔ یہی چیز تھی جس نے حکومت عراق کو بدحواس کر دیا چنانچہ ۱۹۷۹ء کے وسط میں آپ کو نجف الاشرف میں نظر بند کر دیا گیا اور ۵ اپریل ۱۹۸۰ء کو بغداد جیل میں لے جا کر ۹ اپریل ۱۹۸۰ء کی رات کو شہید کر دیا گیا۔